Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1969

سچے مفتی

روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی
اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ (۹/۳۱)
یہود اور نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا لیا تھا۔ تو عدی بن حاتم نے
کہا کہ وہ لوگ ان کی پرستش تو نہیں کرتے پھر انہوں نے انہیں خدا کیسے بنا لیا
تھا۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ جس چیز کو ان کے علماء و
مشائخ حلال قرار دیتے تھے یہ لوگ اسے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے وہ حرام قرار دیتے
تھے اسے حرام۔ یہی علماء اور مشائخ کو خدا بنا لینا ہے۔

([illegible])

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

معراجِ انسانیت

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن - خود قرآن کے آئینے میں
حُسنِ سیرت کی رعنائیاں - خالقِ حُسن کی نگاہ میں

- سیرتِ طیبہ کے ہر گوشے کا عنوان قرآنی آیات اور اس کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں
- ہر واقعہ کی تائید علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رُو سے
- غیر مسلموں کے اعتراضات کا مدلّل اور مسکت جواب
- دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کا خراجِ تحسین

بارگاہِ رسالت مآب صلعم میں

ایک انقلاب انگیز تصنیف • ایک عہد آفریں کوشش • عشق و خرد کا حسین امتزاج •

بڑا سائز • ضخامت قریب پانچسو صفحات • کاغذ نہایت اعلیٰ • جلد مضبوط • گرد پوش جاذبِ نگاہ

قیمت: بیس روپے RS, 20/-

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

مکتبہ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور

خدا اور سرمایہ دار

ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا پیش کش

- کیا اسلام، مغرب کے معاشی نظام کا حامی ہے ؟
- کیا اسلام، اشتراکی نظام کا حامی ہے ؟
- کیا اسلام کا کوئی اپنا معاشی نظام ہے ؟
- اس نظام کی تفاصیل کیا ہیں ؟
- وہ کس طرح دوسرے معاشی نظاموں سے مختلف ہے ؟
- کیا وہ نظام، نوع انسان کے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے ؟
- اس نظام کی مخالفت کس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے اور کیوں ؟

یہ، اور اسی قسم کے دیگر معاشی مسائل کا تجزیہ، تبصرہ اور حل۔ عصرِ حاضر کے پریشاں انسان کے لئے شعاعِ امید۔ اہلِ پاکستان کیلئے قندیلِ راہ۔

قسم اعلیٰ — سفید پرنٹنگ پیپر۔ نہایت روشن طباعت۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔

قیمت — نو روپے

سستا ایڈیشن — نیوز پرنٹ۔ بکس بورڈ کور — قیمت — پانچ روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

Saeed 67

Islam : A Challenge to Religion

(By Parwez)

(1) IDARA-E-TOLU-E-ISLAM,
25-B, Gulberg II, LAHORE

(2) MAKTABA-E-DEEN-O-DANISH
Chowk Urdu Bazar LAHORE

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون
سالانہ ــــ پاکستان ــــ دس روپے	پاکستان ایک روپیہ	۸۰۸۰۰
سالانہ ــــ ہندوستان ــــ پندرہ روپے	ہندوستان ڈیڑھ روپیہ	خط و کتابت
سالانہ ــــ غیر ممالک ــــ ایک پونڈ		ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد (۲۲) ــ فروری ۱۹۶۹ء ــ نمبر (۲)

فہرست

۱۔ لمعات ــــ ۲

۲۔ قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟ ــــ ۱۰

۳۔ قانونی مشورے ــــ (محترم ظفر احسن محمود۔ ایڈوکیٹ) ــــ ۱۲

۴۔ تحریکِ جمہوریت ــــ ۱۷

۵۔ جوانوں کو مری آہِ سحر دے ــــ ۲۹

۶۔ قانون سازی اور علمائے کرام ــــ ۳۳

۷۔ ملک کا معاشی پروگرام ــــ ۴۹

۸۔ استعمار کا عالمی کردار ــــ (محترم خورشید عالم) ــــ ۵۷

۹۔ بنیادی جمہوریتیں ــــ ۶۵

۱۰۔ حقائق و عبر ــــ (ہمارا ٹیلی ویژن) ــــ (یہ بچپن) ــــ ۶۸

۱۱۔ ہمارا پریس ــــ ۷۱

۱۲۔ تبصرہ ــــ (علامہ تمنا عمادی) ــــ ۷۴

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس میکلوڈ روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پس چہ باید کرد؟

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت کے لمعات میں ہم نے (منجملہ دیگر امور) یہ کہا تھا کہ پاکستان کا ایک عام شہری (اور یہی عام شہری ۔COMMEN MAN ۔ ہے جو ملک کی اکثریت کہلاتی ہے) معاشی بدحالی اور شوستانی (CORRUPTION) سے پیدا شدہ بدعنوانی کے ہاتھوں اس درجہ تنگ آچکا ہے کہ اس کے دل سے بے ساختہ یہ جذبہ اُبھرتا ہے کہ

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر تیرا ہی، او بے مہر، سنگِ آستاں کیوں ہو

اور اس کا یہی وہ جذبہ ہے جسے اپوزیشن (EXPLOIT) کر رہی ہے۔ صحبتِ امروزہ میں ہم اربابِ حکومت کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں، بایں امید کہ وہ ان پر نہایت سنجیدگی سے، ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور صرف غور ہی نہ کریں، بلکہ ان میں سے جنہیں وہ مفید سمجھیں، ان پر بلا تاخیر عمل بھی کریں۔ اس ضمن میں اصولی بات یہ سمجھ لیں کہ انتشار پسند طبقہ کی تخریبی کارروائیوں کی روک تھام کے لئے وہ جو مناسب (لیکن مبنی بر اعتدال) اقدامات ضروری سمجھیں، انہیں حسنِ تدبر سے اختیار کریں۔ لیکن اسے علامتِ مرض کا علاج سمجھیں، علّتِ مرض کا نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک علّتِ مرض کا ازالہ نہ کیا جائے، مریض شفایاب نہیں ہو سکتا۔

(۱) معاشی بدحالی

ملک کی معاشی بدحالی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا فطری نتیجہ ہے اور اس کا کما حقہٗ ازالہ نظام کی تبدیلی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اس کا احساس و اعتراف ہے کہ کوئی معاشی نظام، شباشب بدلا نہیں جا سکتا۔ اسے بتدریج ہی بدلا جا سکتا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہوتا ہے کہ جس نظام کو آخر الامر قائم کرنا مقصود ہو، اسکے خط و خال کی متعین طور پر وضاحت کر کے، پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ اس طریق کار کے مطابق، اس وقت،

سب سے پہلے' کرنے کا کام یہ ہے کہ ممتاز شہریوں کی ایک مختصر سی کمیٹی کو ساتھ لے کر' اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ایک متوسط گھرانے کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ـــ کھانا۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج معالجہ وغیرہ ـــ کم از کم کتنے روپے ماہوار میں پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ وہ رقم ہوگی جس کا مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔ ملازمین کی کم از کم تنخواہ یہ ہوگی مزدوروں کی کم از کم اُجرت یہ ہوگی۔ جو لوگ کام کرنے سے طبیعی طور پر معذور ہوں' یا جنہیں کام میسّر نہ آتا ہو' انکا کم از کم الاؤنس اس قدر ہوگا۔ (علاج معالجہ میں صرف روزمرہ کی عام شکایات شامل ہونگی۔ شدید قسم کے امراض، حادثات اور زچگی وغیرہ کا انتظام حکومت کیطرف سے الگ ہوگا)۔ یاد رکھیئے جس طرح ایک بزرگ خاندان (مثلاً باپ) کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام افرادِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے' اسی طرح (قرآنی تصورِ مملکت کیمطابق) ملک کی حکومت کی بھی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے۔ اگر اس کی آمدنی کم ہے تو وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کی صورت پیدا کرے اور جسقدر آمدنی ہے اس کی تقسیم اسطرح کرے کہ افرادِ خاندان میں سے کسی کی ضرورت رُکی نہ رہے۔ ملک کی خوشحالی کا ثبوت ہی یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اسی سے حقیقی امن اور اطمینان پیدا ہو سکتا ہے۔

(۲) ہوشرُبا گرانی

اسوقت ملک کی حالت یہ ہے کہ آج ایک چیز کی قیمت پانچ روپے ہے۔ کل اسی دکاندار سے وہی چیز مانگئے تو وہ اسکی قیمت سات روپے بتائیگا۔ اس سے اس کی وجہ دریافت کیجئے تو وہ ..... جواب میں کہیگا کہ صاحب! آج بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ (چڑھ گیا ہے" اسطرح کہدیتے ہیں جیسے کوئی بندر درخت پر خود بخود چڑھ جائے!) عام شہری بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ بھاؤ چڑھتا کیسے ہے اور اسے چڑھاتا کون ہے۔ اسے بہرحال اُسی چڑھے ہوئے بھاؤ کیمطابق چیز خریدنی پڑتی ہے۔ اور جو بھاؤ ایک مرتبہ چڑھ جاتا ہے' وہ پھر نیچے کبھی نہیں اترتا۔ اوپر ہی چڑھتا چلا جاتا ہے۔

حکومت کو چاہیئے کہ وہ ہر چیز کی قیمت مقرر کرے اور ان قیمتوں کی تختی متعلقہ دکان پر لٹکوائے۔ اگر وہ اسکا کنٹرول نہیں کر سکتی تو اسے ہر جگہ اپنی دکانیں کھولنی چاہئیں جہاں سے ہر ضرورت کی چیز مقررہ نرخ پر مل سکے۔ اپنی دکانیں کھولنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہاں سے خالص چیزیں مل سکیں گی۔ اس وقت تک ملک میں ملاوٹ کا کوئی علاج نہیں ہو سکا بلکہ یہ مرض دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

(۳) رشوت کی لعنت

رشوت، اس معاشی نظام کا منطقی نتیجہ ہے جس میں کسی فرد کو مستقبل کی معاشی ضمانت (SECURITY)

حاصل نہیں ہوتی، اسلئے وہ ہر جائز و ناجائز طریق سے دولت سمیٹنے کی فکر اور جائیدادیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلئے اسکا کلی خاتمہ تو معاشی نظام کی تبدیلی ہی سے ہوگا لیکن اس کی فوری اصلاح کے لئے ہم نے کچھ عرصہ پہلے ایک تجویز پیش کی تھی اور وہ یہ کہ حکومت اپنے ملازمین کو، ان کی اور ان کے بال بچوں کی پوری پوری معاشی ضمانت دیدے اور اسکے بعد ان کے لئے ذاتی املاک (پراپیٹی پراپرٹی) قانوناً ممنوع قرار دیدے۔

(۴) تعلیم کی ذمہ داری

مملکت کے ہر بچہ کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر ہونی چاہیئے۔ حکومت ایک خاص درجہ تک عام تعلیم دینے کے بعد جائزہ لے کہ کونسے بچے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، انہیں مزید تعلیم دیجائے۔ پھر ایک خاص اسٹیج پر طالب علموں کو ان کی افتادِ طبیعت اور ملک کی ضروریات کے پیشِ نظر مختلف شعبوں کی اعلےٰ تعلیم دی جائے۔ جنہیں باہر بھیجنا مفید ہو انہیں باہر بھیجا جائے اور ہر فارغ التحصیل طالب علم کے لئے اسکی تعلیم اور صلاحیت کیمطابق کام مہیا کیا جائے۔ آپ دیکھئے گا کہ اس طرح وہ خلفشار بھی کس طرح خود بخود دور ہو جاتا ہے جو اسوقت طلباء میں پایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر طلبا کا مسئلہ بھی معاشی ہے۔ یہ سیاسی رُخ اسلئے اختیار کر لیتا ہے کہ اُنکے سامنے معاشی دروازے کھلے نہیں ہوتے۔

باقی رہا نصابِ تعلیم میں اسلامیات کا حصہ۔ سو اس سلسلہ میں ہم تفصیلی طور پر بارہا عرض کر چکے ہیں۔ اس وقت مختصر الفاظ میں ہم صرف اتنا دہرا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ طالب علموں کو قرآن کریم میں بیان کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولِ زندگی کی تعلیم (علےٰ قدرِ استعداد) دیجائے اور سیرت و تاریخ میں سے صرف وہ کوائف سامنے لائے جائیں جو ان اقدار کی عملی تشریح کرتے ہوں۔ یہ تعلیم تمام طالب علموں کے لئے یکساں ہونی چاہیئے۔

(۵) عدل

موجودہ نظام کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک مظلوم کو انصاف حاصل کرنے کے لئے اخراجات کا زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ کسی مقدمہ میں جو فریق بھی برسرِ حق ثابت ہو اس پر حصولِ عدل اور دادرسی کے لئے کسی قسم کا بار نہیں پڑنا چاہیئے۔ نیز مقدمات کے فیصلہ میں آجکل جسقدر ناقابلِ برداشت تاخیر ہوتی ہے اس سے نہ صرف انصاف کا گلا گھٹ جاتا ہے بلکہ ملک کی آبادی کے ایک معتد بہ حصہ کا وقت اور توانائی بُری طرح ضائع ہو جاتی ہے۔ اس سے ملک کی مجموعی دولت کی پیدائش پر جس قدر مضر اثر پڑتا ہے وہ بالکل واضح اور عیاں ہے۔ اس مقصد کے لئے کمیشن تو بہت بٹھائے گئے لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ اس کی ایک بڑی وجہ موجودہ قوانین کا پیچیدہ اور مبہم ہونا ہے۔

حصولِ عدل کے معاملہ میں ہمارے ہاں کا طبقۂ نسواں بڑا ہی مجبور و مظلوم واقع ہوا ہے۔ عائلی قوانین نے ان

بیچاریوں کو کچھ تھوڑی سی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں لیکن نظم و نسق کی بے ضابطگیوں سے وہ بھی معطل ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت ضروری ہے کہ فیملی کورٹس کی جج، خواتین ہوں۔ ہمارے ہاں کی عورت کسی عورت کے سامنے ہی اپنی بات بیان کر سکتی ہے، مرد کے سامنے نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو عورت، اپنے جابر و ظالم خاوند سے مخلصی کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اس کی حفاظت کا اپنا انتظام نہ ہو حکومت اسکی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ خاوند کیخلاف قانونی شکایت کے بعد وہ اسکے درپئے آزار ہو جاتا ہے اور مختلف حربوں سے اسے اس قدر تنگ کرتا ہے کہ وہ بیچاری مجبور ہو کر اپنی شکایت واپس لے لیتی ہے اور جب وہ اسکے بعد پھر اسی چنگل میں پھنس جاتی ہے تو وہ انتقام جوئی کے جذبہ کے ماتحت اس پر پہلے سے بھی زیادہ مظالم توڑتا ہے اور اس سے مخلصی حاصل کرنے کی اس مظلوم کے پاس کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ ضرورت ہے کہ حکومت کا نظامِ عدل و عافیت اس طرف خصوصی توجہ دے۔ دنیا میں کوئی معاشرہ مہذب تو کجا شریف نہیں کہلا سکتا اگر اس میں عورت محفوظ نہیں۔

(۶) شکایات کی شنوائی

اس وقت حکومت کے دفاتر میں جس قدر دھاندلی مچ رہی ہے کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اس کیخلاف شکایت کر کے دادرسی حاصل کی جا سکے۔ ویسے تو ہر نیا حاکم، اپنے تقرر کے بعد عام اعلان کرتا ہے کہ اس نے اپنے دروازے پر "عدلِ جہانگیری" کی زنجیر لٹکوا دی ہے لیکن یہ زنجیر لٹکی کی لٹکی رہ جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات فریادیوں کے لئے الٹی زنجیر پا بن جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر دفتر کے ساتھ ایک ایسا اعلیٰ پایہ کا بااختیار افسر تعینات ہو جس تک ہر فریادی رسائی حاصل کر سکے اور وہ اس کی شکایت کی تحقیق کر کے انصاف کا تقاضا پورا کرے۔ ہمارے عوام کو ابھی آدمی پر زیادہ بھروسہ ہے۔ (خدا اس اعتماد کو قائم رکھے) اس لئے اگر آرمی، اپنے بلند کردار افسروں کو اس مقصد کے لئے مستعار دے سکے تو یہ چیز خود ملک کے دفاع کے لئے بھی بڑی مفید ثابت ہوگی۔ ملک کی سول آبادی کی خوشحالی اور طمانیت، ملک کے دفاع کے آدھے مسئلہ کو حل کر دیتی ہے۔

اس قسم کے افسر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ہونے چاہئیں۔ اگر کسی کو معلوم (بلکہ یقین) ہو کہ ایک مقام ایسا ہے جہاں میری شنوائی ہو سکتی ہے تو اس کے دل میں ایجی ٹیشن کا جذبہ ابھرتا ہی نہیں۔ اشتعال تو مایوسی کے ردِ عمل کا نام ہے — آپ کو معلوم نہیں کہ شیطان (سرکشی) اور ابلیس (مایوسی) ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ بلی اُس وقت حملہ کرتی ہے جب وہ کمرے کے سب دروازے بند پاتی ہے۔ اس وقت افرادِ معاشرہ جو ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انہیں اپنی شکایات کی چارہ جوئی کے لئے کوئی دروازہ کھلا نہیں ملتا۔

(۷) حُکّام کا رویّہ

انگریزوں کو اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ یہاں کے عوام کو محکوم اور اپنے آپ کو حاکم سمجھیں۔ انہوں نے افسروں کے لئے، اصطلاح تو وہی رائج کی جو ان کے اپنے ملک میں مروج تھی۔ یعنی (PUBLIC SERVANTS) ۔عوام کے خادم۔ لیکن عملاً وہ رہے حاکم کے حاکم ہی۔ ہم نے نظامِ حکومت انہی سے ورثہ میں پایا ہے اور اگرچہ اب صورت یہ ہے کہ ملک میں کسی کو محکوم سمجھنا، پاکستان کی آزادی کے دعویٰ کے منافی ہے لیکن عملاً ہمارے عُمّالِ حکومت، اپنے آپ کو انگریزوں جیسا حاکم اور افرادِ معاشرہ کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی "داروغہ صفائی" بھی کسی راہرو سے بات کرتا ہے تو ایسی رعونت سے گویا اسے اختیاراتِ شاہی حاصل ہیں۔ عمّالِ حکومت کے اس ذلت آمیز رویّہ نے بھی ملک میں انتظامیہ کیخلاف جذباتِ نفرت عام کر رکھے ہیں۔ ضرورت ہے کہ علامہ اقبالؒ کی یہ نصیحت ایوانِ حکومت کے ہر در و دیوار پر کندہ، اور عمالِ حکومت میں سے ہر ایک کے لوحِ قلب پر نقش کر دی جائے کہ

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلگدازے

(۲) سیاسی اصلاحات

یہاں تک ہم نے معاشی اور معاشرتی اصلاحات کا ذکر کیا ہے، جنہیں بروئے کار لانے کی اشد اور جلد ضرورت ہے۔ اب چند ایک تجاویز سیاسی نظام کے سلسلہ میں بھی پیش خدمت ہیں۔

۱۔ ایمرجنسی

جنگ کے زمانہ اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک (یا اگر جنگ کا خطرہ لاحق ہو تو) ایمرجنسی (ہنگامی حالات) کی ضرورت لاینفک ہوتی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اب ملک میں ایسے حالات نہیں رہے اسلئے ایمرجنسی کی بھی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بلا ضرورت ایمرجنسی فائدہ کے بجائے الٹی نقصان کا موجب ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں اسے اب اُٹھا لینا چاہیئے اور آئین میں درج شدہ بنیادی حقوق کو بحال کر دینا چاہیئے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جس بات سے انسان کو روکا جائے اس کی طرف اس کی طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صحت مند معاشرہ وہی کہلا سکتا ہے جس میں رکاوٹیں کم از کم ڈالی جائیں۔ ویسے بھی جب رکاوٹیں معاشرہ کا معمول بن جائیں تو وہ اپنی افادی حیثیت کھو دیتی ہیں۔ جیسے آجکل دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اس دفعہ کو بھی اشد ضرورت کے وقت ہی استعمال کرنا چاہیئے۔

۲۔ سیاسی قیدی

ایمرجنسی اٹھا دینے کے بعد سیاسی قیدیوں کی پوزیشن کا بھی از سرِ نو جائزہ لینا چاہیئے۔ اور بجز ان قیدیوں اور نظربندوں کے جن کی نقل و حرکت یا دیگر سرگرمیاں استحکامِ مملکت کے لئے فی الواقعہ ضرر رساں ہوں باقیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دینا چاہیئے۔ اصولاً پابند صرف اُسے کرنا چاہیئے جس کی آزادی انسانیت کے لئے باعثِ مضرت ہو۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی بڑی اہم ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کے خلاف سیاسی نوعیت کا مقدمہ قائم کرنا ہو تو اس امر کا اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہیئے کہ اس کے لئے ضابطہ کی تمام کاروائی بالکل درست اور مکمل ہے اور متعلقہ قانون کی تعبیر بالکل صاف اور واضح ہے۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ حکومت کسی کیخلاف سیاسی مقدمہ قائم کرتی ہے۔ اور عدالت کسی ٹیکنیکل خامی کی وجہ سے مقدمہ خارج کر دیتی ہے۔ عوام اس باریکی کو تو سمجھتے نہیں کہ مقدمہ خارج ہونے کی وجہ ضابطہ کا کوئی سقم تھا۔ عام تاثر یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ حکومت یونہی دھاندلی سے مقدمات دائر کر دیتی ہے اور عدالت ملزم کو مجرم نہ پاکر بری کر دیتی ہے۔ اس سے بھی عوام کے دل میں حکومت کیخلاف بداعتمادی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ تشدد کا استعمال

اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا مقام آجاتا ہے جہاں امنِ عامہ کے قیام اور پُرامن شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے حکومت کیطرف سے قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن قوت کے استعمال کا فیصلہ بڑے ہی غور و تدبر کے بعد نہایت ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیئے اور اس طریق کو اس وقت اختیار کرنا چاہیئے جب حفظِ امن کی اور کوئی صورت باقی نہ رہے۔ تجربہ نے یہ بتایا ہے کہ کسی ایک موقعہ پر بھی قوت کا بے جا، یا زائد از ضرورت استعمال، امنِ عامہ قائم کرنے کے بجائے الٹا اشتعال اور فساد کا موجب بن جاتا ہے۔ حالیہ خلفشار میں لاہور کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہاں مختلف قسم کے مظاہروں کو حسنِ تدبر سے نپٹایا گیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خلفشار کی آگ خود بخود دھیمی پڑتی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے جمعیت العلماء کے مجوزہ جلوس کے سلسلہ میں جو لاٹھی چارج ہوا (اگر اخبارات میں شائع شدہ خبریں صحیح ہیں تو) اسے کون قابلِ مذمت قرار نہیں دیگا۔ اس ایک ناشدنی واقعہ سے شہر کی بنی بنائی فضا خراب ہو گئی اور صدرِ مملکت تک کو اس پر اظہارِ تاسف کرنا پڑا۔ ایسے مقامات پر بڑی ہی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ہم ایک بات پبلک کے گوش گزار کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ پولیس جب کسی ہجوم پر لاٹھی چارج کرتی ہے تو وہ از خود ایسا نہیں کرتی۔ اسے کوئی افسر مجاز (مثلاً مجسٹریٹ علاقہ وغیرہ) ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور وہ اس حکم کی تعمیل میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ حکم، درحقیقت اس مجسٹریٹ کا بھی نہیں ہوتا۔ وہ حکومت کی طے شدہ

پالیسی کے ماتحت ایسا کرتا ہے۔ بنابریں، اس قسم کے واقعات میں، پولیس یا مجسٹریٹ کیخلاف غم و غصہ کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ حکومت کیخلاف صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیئے۔ دوسری طرف حکومت کو بھی چاہیئے کہ ایسے مواقع پر، آگے بڑھ کر ذمہ داری اپنے اوپر لے (اگر کسی افسر نے حکومت کے فیصلہ کیخلاف کچھ کیا ہے تو اس سے محکمانہ طور پر باز پرس کرے) موجودہ حالات میں افسرانِ متعلقہ عجیب مخمصہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے فیصلوں پر عملدرآمد نہیں کرتے، تو اس کی نظروں میں معتوب ہو جاتے ہیں۔ عمل کرتے ہیں تو پبلک کی نگاہوں میں مطعون قرار پا جاتے ہیں ـــ غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را ـــ ملازمِ حکومت کی ایک حیثیت ذاتی ہوتی ہے اور دوسری حیثیت بہ لحاظ منصب۔ اگر وہ اس دوسری حیثیت میں اپنے فرائض مفوضہ کو سرانجام دیتا ہے تو حکومت کا فریضہ ہونا چاہیئے کہ اس کی ہر طرح سے حفاظت کرے۔ اس سلسلہ میں ہم اپوزیشن کے لیڈروں سے بھی گزارش کرینگے کہ وہ اس قسم کے اقدامات پر افسرانِ ماتحت کو مطعون نہ کریں۔ انہیں مطعون کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں تلقین کرتے ہیں کہ وہ حکومت کے احکام یا فیصلوں کی تعمیل نہ کریں۔ اب آپ سوچیئے کہ اگر آپ نے انہیں یہ سبق پڑھایا اور کل کو آپ کی حکومت قائم ہو گئی تو آپ ان سے اپنے فیصلوں کی تعمیل کیسے کرائینگے؟ ملک کا نظم و نسق تو اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ ملازمین جب تک ملازمت میں رہیں، حکومتِ وقت کے وفا شعار رہیں۔ اور حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ پبلک کے سامنے اپنے فیصلوں کی جوابدہی خود کرے، نہ کہ آپ پیچھے رہے اور افسرانِ ماتحت کو عوام کا ہدفِ ملامت بننے دے۔

اپوزیشن کے لیڈروں کے لئے ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم بالکل پُرامن مظاہرے کرتے ہیں۔ لیکن حکومت خواہ مخواہ تشدد پر اتر آئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کا مقصد پُرامن مظاہرہ کرنا ہوتا ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ گزشتہ دنوں ملک میں، آپ کی طرف سے جو مظاہرے ہوئے ہیں، اُنکے عواقب میں شکست و ریخت اور آتش زنی وغیرہ کی واردات رونما ہوتی رہی ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ اس کے ذمہ دار ہم نہیں، شرپسند عناصر ہیں جو ان مظاہروں میں شریک ہو کر تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔ اس سے دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا حکومت کے لئے ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ اس قسم کی تخریبی کارروائیوں کو روکے، اور اگر یہ کسی اور طریق سے نہ رُک سکیں تو قوت کا استعمال کرے؟ آپ حضرات، حکومت کیطرف سے قوت کے استعمال کے خلاف تو شور مچانے لگ جاتے ہیں لیکن شرپسند عناصر سے کچھ نہیں کہتے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ شرپسند عناصر آپ کے ان مظاہروں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں تخریبی کارروائیوں سے روک دینا آپکے بس کی بات نہیں، تو کیا امنِ عامہ کے پیشِ نظر یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ ان مظاہروں کو بند کر دیں تاکہ شرپسند عناصر ان سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔ جو بات کسی تخریبی کارروائی کا (بالواسطہ ہی سہی) ذریعہ بن سکتی ہے کیا اسے روک دینا قرینِ مصلحت نہیں ہوتا۔ یہ مظاہرے بالآخر کونسا خدا اور رسول کا فرمان ہیں جس کی تعمیل واجب ہے۔ اور کیا آپ اپنی حکومت میں اس قسم کی صورتِ حال کو جاری رہنے کی اجازت دینگے؟

۴۔ گفتگوئے مصالحت

صدر مملکت نے اپنی (یکم جنوری کی) ماہانہ تقریر میں خاصی کشادہ نگہی کا ثبوت دیا ہے۔ ہم ان کی خدمت میں بصد احترام گزارش کرینگے کہ وہ اس باب میں ایک قدم اور آگے بڑھ جائیں اور حزبِ مخالف کے اکابرین کو دعوت دیں کہ وہ ایک "گول میز" کے گرد بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر خوشگوار ماحول میں گفتگو کریں۔ صدر مملکت کا مقام (بہ حیثیت منصب) بزرگِ خاندان کا سا ہوتا ہے اور مخالفین کے (بعض اوقات) قابلِ اعتراض رویّہ کے باوجود اس کی طرف سے وسعتِ ظرف کا مظاہرہ اس کے احترام میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے

دوسری طرف ہم احزابِ مخالف سے عرض کرینگے کہ اربابِ اقتدار کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا ہے اسکے متعلق آپ کہہ دیتے ہیں کہ یہ اُن کی ذاتی رائے (یا فیصلہ) ہے، عوام اس سے متفق نہیں۔ اس کے برعکس، آپ جو تجاویز پیش کرتے ہیں، ان کے متعلق آپ کا دعوٰے یہ ہوتا ہے کہ انہیں جمہور کی تائید حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس اس دعوٰی کی صداقت کا کیا ثبوت ہے کہ آپ کی تجاویز کو جمہور کی تائید حاصل ہے؟ محض چند جلسوں اور جلوسوں سے تو اس نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس لئے آپ بھی جو کچھ کہتے ہیں وہ آپ ہی کی آراء یا تجاویز ہیں۔ اس لئے وہ بھی اس باب میں حرفِ آخر نہیں قرار پا سکتیں۔ انہیں عوامی تائید کا حامل قرار دیئے جانے کا معیار الیکشن ہو سکتا تھا۔ اسے آپ نے بائیکاٹ کر دیا۔ اب آپ اس کا دعوٰے کیسے کر سکتے ہیں کہ آپ کی تجاویز کو عوامی تائید حاصل ہے! لہٰذا، گفتگوئے مصالحت کے لئے پہلے ہی سے اس قسم کی شرطیں مقرر نہیں کر لینی چاہئیں۔ ہمارے نزدیک، (اور یہ صرف ہماری رائے ہے) بحالاتِ موجودہ، صدارتی نظام، مستحکم مرکز اور ون یونٹ کا برقرار رہنا تو استحکامِ مملکت کے لئے ضروری نظر آتا ہے لیکن طریقِ انتخاب کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں جس میں تبدیلی استحکامِ مملکت پر اثر انداز ہوتی ہو۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر جزئی مسائل میں باہمی گفت و شنید سے اعتدال کی راہ نکالی جا سکتی ہے۔ اس سے وہ خلفشار ختم ہو جائے گا جس سے ملک اس وقت دوچار ہے۔ اس خلفشار کے نتائج جس قدر خطرناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں، اسکے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کم از کم اتنا تو حزبِ موافق اور حزبِ مخالف، دونوں کو علم ہے کہ ایک مہیب دشمن ہر وقت، عقاب کی طرح، ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے اور وہ اس تاک میں ہے کہ کب موقعہ ملے اور وہ ہم پر جھپٹے۔ ملکوں کا داخلی انتشار بیرونی خطرات کو بلاوا بھیجنے کا موجب بن جایا کرتا ہے۔ عزت الاثم (FALSE PRESTIGE) کے زعمِ باطل میں اس حقیقت کو فراموش نہ ہونے دیجئے!

(مورخہ ۱۹-۱-۶۹)

باسمہٖ تعالیٰ

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟

طلوعِ اسلام جس قسم کا قرآنی معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے اس میں :-

(۱) ہر شخص کی عزت، بلا تمیز مذہب، رنگ، نسل، پیشہ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے۔ اس کا کیریکٹر کیسا ہے اور وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

(۲) کوئی شخص بیکس ولاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملیگا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحبِ اثر، انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

(۳) کوئی فرد بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان وغیرہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(۴) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت اور (بوقت ضرورت) علاج معالجہ کا نسلی بخش اور بلا قیمت انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشاء، حصولِ علم کے علاوہ، فرد کی ذات کا استحکام اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔ "فرد" میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور سفرِ زندگی میں دوش بدوش چلنے کے قابل۔

(۵) ہر شخص اپنی پوری استعداد اور محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کرینگے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور کچھ لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

(۶) ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب حاجتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دیگا۔

اور عند الضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیگا۔ کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔ یہ سب کچھ قرآنی نظام کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

(۷) رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) اُمت کی تحویل میں رہیئے۔ تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ قرآنی نظام انہیں نظم ونسق کی خاطر، بطور امانت افراد کے سپرد کرے گا۔

جب افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(۸) ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق۔ (اس میں گروہوں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا) اسلئے اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا نہ استبداد۔ نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔

(۹) ہر شخص کھل کر بات کریگا۔ اس کے دل میں نہ کسی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا، نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا اور دھوکا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

(۱۰) یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے اٹل ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ معاشرہ قائم ہی انہیں بنیادوں پر ہوگا۔

(۱۱) اس معاشرہ میں نظامِ حکومت کمیونزم کی ڈکٹیٹرشپ یا مغرب کی لادینی جمہوریت یا تھیاکریسی کے بجائے خالص قرآنی اصولوں کے مطابق قائم ہوگا۔

طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اگر آپ بھی اس سے متفق ہوں تو اس کے لئے آپ طلوعِ اسلام سے تعاون کریں اور اس کیخلاف پھیلائے ہوئے غلط خیالات کو اہمیت نہ دیں۔ کیونکہ وہ جھوٹا پراپیگنڈہ ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

—— (۰) ——

قانونی مشورے

نومبر ۱۹۶۸ء کے طلوعِ اسلام میں محترم ظفر احسن محمود ایڈووکیٹ کا ایک مکتوبِ گرامی شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے للّٰہیت کے طور پر یہ پیشکش کی تھی کہ جو مظلوم اور بے سہارا خواتین اپنی عائلی زندگی کے تنازعات کے سلسلہ میں ان سے مشورہ طلب کریں گی وہ انہیں بلامعاوضہ قانونی مشورہ دیں گے۔ اس پیشکش کے جواب میں انہیں مختلف گوشوں سے مظلوم خواتین یا ان کے متعلقین کی طرف سے متعدد خطوط موصول ہونے شروع ہو گئے ہیں جن کا وہ انفرادی طور پر جواب دیتے ہیں۔ ان میں بعض استفسارات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق کسی خاص فرد سے نہیں ہوتا بلکہ اس قسم کے واقعات ہمارے معاشرہ میں عام ہوتے ہیں۔ اس قسم کے معاملات کے سلسلہ میں مناسب سمجھا گیا ہے کہ یہ استفسارات اور محترم ظفر صاحب کی طرف سے ان کے جوابات طلوعِ اسلام میں شائع کئے جاتے رہیں تاکہ دیگر ضرورت مند خواتین و حضرات بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر چند ایک استفسارات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔

واضح رہے کہ محترم ظفر صاحب کے یہ جوابات محض ایک ایڈووکیٹ کا قانونی مشورہ ہیں۔ ان کی حیثیت خود قانون یا کسی عدالت کے فیصلہ کی نہیں جو کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لئے قانونی سند بن سکیں۔ ان مشوروں سے استفادہ کے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیئے۔

(۲) ادارہ اپنے ہزارہا قارئین کی طرف سے محترم ظفر صاحب کی اس مخلصانہ خدمت کے لئے ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہے۔ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور جاری رکھیں گے۔ ان کا پتہ ایک مرتبہ پھر نوٹ کر لیجئے۔

محترم ظفر احسن محمود صاحب۔ ایڈووکیٹ ہائیکورٹ۔ ۱۷ بیگم روڈ۔ لاہور

(٥)

(۱) استفسار

محترمی —! ہماری بیٹی عرصہ تین سال ہوئے فوت ہو گئی۔ اُس کے دو لڑکے عمر ۹ سال، ۱۳ سال اور دو بچیاں

عمر ۱۳ سال و ایک سال ہمارے یعنی نانا اور نانی کے پاس زیر پرورش آ گئے۔ بچے ہم سے بے حد مانوس ہو چکے ہیں۔ بچوں کے والد نے اُن کی والدہ کی فوتیدگی کے فوراً بعد نئی شادی رچالی اور اُس میں سے ایک لڑکا بھی ہے۔ اب اُس نے ہمارے خلاف دعوائے گارڈین جج کی عدالت میں دائر کر دیا ہے۔ کیا ہم بچوں کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ قانونی حوالہ جات دیجئے گا۔

آپ کی بہن۔ (ن)

جواب

محترمہ ہمشیرہ! گارڈین بننے کے لئے اولین ترجیح تو والد ہی کو دی جائے گی اور یہی تصور ہوتا ہے کہ بچوں کی بہترین بہبود اُن کے والد کے زیر سایہ عاطفت ہی ہوگی۔ اس بارہ میں ہماری عالیہ عدالتوں کے فیصلہ جات یہ ہیں کہ محض دوسری شادی یا اُس میں سے اولاد کی وجہ سے کوئی مفروضہ قائم نہیں ہوتا کہ والد بچہ کی پرورش بہترین طریق پر نہ کر سکیگا۔ (PLD 1962 Lah. 142) لیکن یہ واضح رہے کہ عدالتوں کے لئے اوّلین اور ضروری ترین مصلحت یہ ہے کہ بچوں کی فی الواقع بہبود و بہتری کس صورت میں ہے۔ اگر والد کی دوسری شادی اور سوتیلی والدہ کا سلوک۔ والد کی مالی حالت اور دیگر حالات ایسے ہیں کہ نانی نانا اُنکے مقابلہ میں بدرجہا بہتر پرورش کرنے کے اہل ہیں اور ایسا کر رہے ہیں تو عدالت کے راستہ میں کوئی ایسا امر مانع بھی نہیں کہ وہ حضانت کا صرف والد کے حق ہی میں فیصلہ کرے۔ اس بارہ میں ملاحظہ ہو۔

PLD 1965 Karachi 416 ، PLD 1965 Lahore 695

ان نظائر کے بعد ماتحت عدالتوں نے بے شمار فیصلے ان کے تتبع میں صادر کئے ہیں لیکن اس امر کا بار ثبوت آپ پر ہوگا کہ کیا یہ واقع ہے کہ والد اور سوتیلی والدہ کے مقابلہ میں بچوں کی فلاح و بہبود نانا اور نانی کے پاس زیادہ بہتر طریق پر ہوگی۔ فقط

(۲) استفسار

(۱) میرے داماد نے میری لڑکی سے دھوکا اور دباؤ ناجائز سے دستاویز لکھوالی ہے کہ وہ بخوشی تمام حق مہر سے دستبردار ہوتی ہے اور اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ کیا وہ دستاویز منسوخ ہو سکتی ہے؟

(۲) لڑکا خبیث امراض میں مبتلا ہے۔ اُس کی والدہ اور لڑکے نے یہ امر مخفی رکھا۔ کیا اُن کے خلاف چارہ جوئی ہو سکتی ہے؟

(۳) لڑکی حاملہ ہے۔ کیا تنسیخ نکاح کی کاروائی فوری طور پر ہو سکتی ہے یا وضع حمل کا انتظار کرنا پڑیگا؟

(۴) لڑکا میری بچی کو چھوڑ کر کینیڈا جا رہا ہے۔ کیا اُسے روکا جا سکتا ہے؟

(م ۔ س)

جواب

محترمی! سلامت ـــــ (۱) دستاویز کی منسوخی کے لئے آپ دعوٰے دیوانی بھی کر سکتے ہیں ۔ اسکے علاوہ تمام متعلقہ افراد کے خلاف آپ پولیس کے پاس زیر دفعات 420 ، 467 ، 468 - 471 تعزیرات پاکستان پرچہ دے سکتے ہیں جس کی تفتیش کی وجہ سے پولیس اس کا پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے سکتی ہے اور تا فیصلہ مقدمہ یہ پاسپورٹ اُن کے قبضہ میں رہے گا۔ سزا یابی کی صورت میں پاسپورٹ منسوخ ہو جائیگا۔

(۲) امراضِ خبیثہ کی وجہ سے دعوٰے تنسیخ نکاح دائر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ متعلقہ افراد سے آپ دعوٰے کر کے ہرجانہ وغیرہ وصول کر سکتے ہیں ۔ اس امر کے متعلق پرچہ یا دیگر فوجداری کارروائی کے لئے کوئی جواز موجود نہیں ۔

(۳) کارروائی تنسیخ نکاح کے لئے وضع حمل تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ۔ البتہ ڈگری عدالت صادر ہو جانے کے بعد وہ نافذ العمل اُس وقت ہو گی جب تین ماہ کا عرصہ گزر جائے یا وضع حمل ہو جائے ۔ ان میں سے جو میعاد طویل ہو گی اُس عرصہ تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس دوران میں مصالحتی کونسل نوٹس ملنے پر مصالحت وغیرہ کا انتظام کرے گی ۔

(۴) اگر آپ اپنی یونین کونسل یعنی وہ یونین کونسل جس کے حلقۂ سماعت میں بیوی رہائش پذیر ہے کے پاس درخواست برائے خرچہ نان و نفقہ دے دیں تو چیئرمین یونین کونسل خاوند کو بیرونِ ملک جاتے سے روک سکتا ہے اور اُسے بلا کر پاسپورٹ اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے۔ خرچہ مقرر ہونے کی صورت میں وہ بیرونِ ملک جانے سے قبل اس امر کا مناسب انتظام کرنے کا ذمہ دار ہو گا کہ بیوی کو مقررشدہ خرچہ باقاعدگی سے ملتا رہے ۔

فقط !

(۰)

(۳) استفسار

چند ماہ ہوئے ایک لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف اس کے چچا اور چچی نے کر دی ۔ لڑکی کے ماں باپ نہیں ہیں ۔ لڑکی نے لڑکے کو دیکھا تک نہیں تھا ۔ لہٰذا وہ بچاری رخصت ہو کر سسرال چلی گئی اور اگلے ہی روز سے وہ سخت پریشان ہے کہ میں اس کی بیوی بن کر ہرگز نہیں رہ سکتی اور اس کا یہ فیصلہ اٹل ہے کہ میں اس کو طلاق دونگی۔ اب اگر وہ اس کو طلاق دے تو اس کی میعاد کیا ہو گی اور اگر لڑکا طلاق نہ دینا چاہے تو اس صورت میں لڑکی کیا کرے؟

جواب

لڑکی نے غلطی کی جو نکاح کے وقت مجبوراً ہاں کر دی۔ نابالغ لڑکی کا کوئی نکاح نہیں کر سکتا۔ اور بالغ لڑکی کو کوئی نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا۔

(۲) نکاح نامہ میں ایک خانہ ہوتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ کیا خاوند نے حق طلاق بیوی کو تفویض کر دیا ہے؟ اگر اس خانہ کے جواب میں نکاح نامہ میں یہ درج ہے کہ تفویض کر دیا ہے تو پھر لڑکی کو نکاح فسخ کرانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اس کے لئے کرنا صرف یہ ہوگا کہ ایک نوٹس خاوند کو دیا جائے کہ میں اپنے حق طلاق استعمال کرتی ہوئی تمہیں طلاق دیتی ہوں۔ اس نوٹس کی ایک نقل اس یونین کونسل کے چیئرمین کو بھیجنی ہوگی جس کے حلقہ میں وہ لڑکی رہتی ہے۔ اس پر چیئرمین ایک مصالحتی کونسل مرتب کرے گا جس میں ایک نمائندہ خاوند کا ہوگا اور ایک بیوی کا۔ یہ مصالحتی کونسل ان دونوں میں مصالحت کی کوشش کرے گی۔ اگر یہ کوشش ناکام رہے گی تو نوٹس کی تاریخ سے نوے دن کے بعد طلاق خود بخود مؤثر ہو جائے گی۔ ہاں اگر بیوی حاملہ ہو تو پھر وضع حمل کے بعد طلاق مؤثر ہوگی لیکن طلاق کا شمار اسی تاریخ سے ہوگا جس تاریخ سے بیوی نے نوٹس دیا تھا۔ واضح رہے کہ چیئرمین کو نوٹس دینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ہاں مقدمہ دائر کیا گیا ہے اور وہ اس پر فیصلہ دیگا کہ نکاح فسخ کر دیا جائے یا نہ۔ نہ یہ مقدمہ ہوتا ہے اور نہ ہی چیئرمین اس پر کوئی فیصلہ دیتا ہے۔ چیئرمین کا کام باہمی مصالحت کی کوشش کرانا ہوتا ہے اور بس۔ اگر اس کی یہ کوشش ناکام رہے تو پھر طلاق خود بخود مؤثر ہو جاتی ہے۔

اگر نکاح نامہ میں یہ لکھا ہے کہ فلاں فلاں شرط کے ماتحت حق طلاق تفویض کیا گیا ہے تو ان شرائط کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔

(۳) لیکن اگر نکاح نامہ میں حق طلاق تفویض نہیں کیا گیا تو پھر بیوی کو فیملی کورٹ (عدالت) میں خلع حاصل کرنے کی درخواست دینی ہوگی۔ اور اس میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ بیوی کو واقعی خاوند سے نفرت ہے اور نفرت کی وجوہات یہ ہیں۔ یہ مقدمہ ہوگا جس پر عدالت فیصلہ صادر کرے گی۔ ایسا مقدمہ دائر کرنے کے لئے کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔ یہ جب جی چاہے دائر کیا جا سکتا ہے۔ فقط!

(۰)

(۴) استفسار

ہمارے قریب ایک شادی شدہ بال بچوں والی نیک سیرت عورت رہتی ہے جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ وہ اپنے درندہ صفت خاوند کے مظالم سے تنگ آکر اپنی کلو خلاصی کے لئے قانونی چارہ جوئی کر رہی ہے اور مجھ سے

مدد کی طالب ہوئی ہے۔ میں، محض خدا واسطے، اپنی بیٹی کی طرح اس کی امداد کرتا ہوں۔ اب اس کے شوہر نے مجھے قسم قسم کی دھمکیاں دینی شروع کر دی ہیں کہ وہ مجھے اس طرح اذیت پہنچائے گا اور جان سے مار ڈالے گا۔ اسکے علاوہ اس نے میرے خلاف اتہامات بھی تراشنے شروع کر دیئے ہیں۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟

جواب

درندہ صفت شوہر مظالم کرتے ہی ان بیویوں پر ہیں جو بے سہارا اور بے آسرا ہوتی ہیں۔ اس لئے جب کوئی خدا کا بندہ حقہ، للہ، ان مظلوموں کی مدد کے لئے اٹھتا ہے تو خاوند اس کے خلاف ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ ان مظلوموں کی مدد اور حفاظت چھوڑ دیں۔

اگر آپ اس عزیزہ کی مدد اس کے مظلوم ہونے کی وجہ سے، اپنی بیٹی کی طرح کر رہے ہیں، تو اس کا ساتھ قطعاً نہ چھوڑیئے، ورنہ اس بچاری پر پہلے سے بھی زیادہ مظالم ہونے لگ جائینگے۔ اس کا شوہر اگر آپ کو مار ڈالنے یا اذیت پہنچانے کی دھمکیاں دیتا ہے تو آپ اسکے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائیے وہ اس سے حفظِ امن کی ضمانت لے لیگی اور آپ کی حفاظت کا انتظام کریگی۔ باقی رہے جھوٹے اتہامات، تو اس کے لئے آپ ازالہ حیثیتِ عرفی کے لئے پولیس میں رپورٹ لکھوایئے یا دیوانی دعویٰ دائر کر دیجئے۔ لیکن سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ اپنے معاشرہ میں اپنی پوزیشن اس طرح واضح کر دیں کہ آپ کے ملنے اور جاننے والے اس کے الزامات سے متاثر نہ ہوں۔ الزام تراشی سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شریف آدمی اپنی بدنامی سے ڈر کر مظلوم کی مدد کرنا چھوڑ دے۔ اور غلط معاشرہ میں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں مشکل آیا کرتی ہے کہ کوئی شخص بلا کسی ذاتی غرض کے کسی مظلوم کی مدد، محض ہمدردی کی خاطر بھی کر سکتا ہے۔ آپ اس سے نہ گھبرایئے۔ فقط!

(۰)

(۵) استفسار

نکاح کی ایک مجلس میں، نکاح خواں (مولوی صاحب) جب نکاح نامہ کے اس کالم پر پہنچا جس میں لکھا ہوتا ہے کہ آیا شوہر نے حقِ طلاق تفویض کر دیا ہے، تو اس نے خود ہی اس کے سامنے × نشان لگا دیا۔ جب اس سے کہا گیا کہ یہ کیا، تو اس نے کہا کہ یہ کالم خلاف شریعت ہے اس لئے اس کے سامنے ایسا ہی نشان لگانا چاہیئے۔ فریقین نے بمشکل تمام اسے اس خانہ کے سامنے ہاں لکھنے پر آمادہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا نکاح نامہ کے اندراج کے لئے نکاح خواں کا بلانا ضروری ہے۔ اور کیا وہ اس کے اندراج میں از خود دخل اندازی کر سکتا ہے ؟

جواب

نکاح نامہ کا فارم پُر کرنے کے لئے کسی نکاح خواں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ فارم یونین کونسل یا رجسٹرار نکاح

(باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ ہو)

تحریکِ جمہوریت

اسکے اسباب ——— اور اسکا مقصد

آج کل ملک کی سیاسی فضا میں، "بحالیٔ جمہوریت" کا نعرہ ایک سلوگن کی حیثیت اختیار کر رہا ہے اور اس مقصد کے لئے "تحریکِ جمہوریت" کو اس انداز سے پیش کیا جا رہا ہے گویا یہ امرت دھارا ہے جس سے قوم کے تمام دکھوں کا علاج ہو جائے گا۔ اس سے وہ مقصد حاصل ہو جائے گا جس کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔ اس سے یہاں کی مملکت اسلامی بن جائے گی اور آدم پھر سے اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پالے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر سیاسی شعور رکھنے والا یہ جاننے کے لئے متمنی و مضطرب ہوگا کہ تحریکِ جمہوریت بالآخر ہے کیا اور بحالیٔ جمہوریت سے مقصود کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے، ناظم شعبہ تحریکِ جمہوریت مغربی پاکستان کی طرف سے، عنوانِ بالا کے تحت، ایک پمفلٹ شائع کیا گیا ہے جو مشتمل ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ان چار تقاریر پر جو انہوں نے رابطۂ عوام مہم کے سلسلہ میں ۱۹۶۸ء کے آغاز میں مختلف شہروں میں کی تھیں۔ آیئے، ہم دیکھیں کہ اس میں اس تحریک کا مقصد کیا بتایا گیا ہے اور پروگرام کیا، اور یہ چیزیں کس حد تک اس دعوے کی صداقت پیش کرتی ہیں کہ بحالیٔ جمہوریت سے ملک میں اسلام کا احیاء ہو جائے گا۔

۱۔ بھان متی کا کنبہ

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ تحریکِ جمہوریت میں جو مختلف سیاسی پارٹیاں شامل ہوئی ہیں، ان میں قدرِ مشترک کیا ہے، اور مقصود و منتہیٰ کیا۔ اس باب میں زیرِ نظر پمفلٹ کے شروع میں کہا گیا ہے۔

> آپ کو معلوم ہے کہ اس تحریک میں کئی جماعتیں شریک ہیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک پروگرام ہے۔ ہر ایک اپنا ایک منشور رکھتی ہے۔ ہر ایک اپنے کچھ مقاصد رکھتی ہے۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم میں سے

کسی کا پروگرام بھی اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک کہ ملک کے باشندوں کی طرف ملک کی حکمرانی کے اختیارات منتقل نہ ہو جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے کے قائل نہ ہوں بلکہ آئینی اور جمہوری طریقوں کے پابند ہوں وہ اپنے نظریہ اور پروگرام کو عمل میں لانے کا صرف ایک ہی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ عوام میں اپنے خیالات کی تبلیغ کریں اور رائے عامہ کو اس کا قائل کریں کہ ملک کے مسائل کا جو حل وہ پیش کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ لیکن یہ طریق کار اسی صورت میں بار آور ہو سکتا ہے جبکہ فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہو۔ اور ان کی رائے ہموار ہو جانے کے معنی یہ ہوں کہ ملک کا نظام اس نظریہ اور پروگرام پر چلے گا جسے انہوں نے پسند اور قبول کیا ہے۔ ایسی حالت اگر ملک میں موجود ہو کہ لوگ جس چیز کو ناپسند کریں وہ رد ہو جائے اور جس چیز کو وہ پسند کریں وہی جمہوری طریقے پر نافذ ہو، تو پھر پارٹیوں اور جماعتوں کے متحد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس صورت میں ہر جماعت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا منشور لے کر عوام کے سامنے آجائے۔ اور لوگوں کی رائے اپنے نظریہ اور پروگرام کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرے۔۔۔۔ اس وجہ سے یہ ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ سب سے پہلے ہم سب متحد ہو کر یہاں جمہوریت کو بحال کرنے کی کوشش کریں۔ (ص ۳-۲)

اس "بحالیٔ جمہوریت" سے مراد کیا ہے، اس کے متعلق، مختصر الفاظ میں کہا گیا ہے کہ

ہمارے پاس ۱۹۵۶ء کا دستور بنا بنایا موجود ہے جسے ملک کے نمائندوں نے بنایا تھا اور جسے بغیر کسی جائز قانونی حق کے، منسوخ کر دیا گیا۔ ہمیں کوشش صرف یہ کرنی چاہیئے کہ فیلڈ مارشل صاحب کے دستور کی جگہ ملک کے نمائندوں کا بنایا ہوا دستور پھر سے جاری ہو جائے۔ (ص ۲۱)

لہٰذا، بات یوں ہوئی کہ

(۱) اس وقت تحریکِ جمہوریت میں جتنی پارٹیاں شامل ہیں، ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا منشور اور اپنا اپنا پروگرام ہے۔ ان میں سے کوئی دو جماعتیں بھی کسی ایک منشور اور ایک پروگرام پر متفق نہیں۔

(۲) اس وقت ان کے سامنے ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۶۲ء کے (موجودہ) آئین کو منسوخ کر کے اس کی جگہ ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ کر دیا جائے۔ (وہ آئین منسوخ کیسے ہو اور اس کی جگہ ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ کس طرح کیا جائے، اس کے متعلق پمفلٹ میں کچھ نہیں کہا گیا۔)

(۳) جب ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ ہو جائے تو تحریکِ جمہوریت میں شامل شدہ پارٹیوں میں سے ہر پارٹی اپنا اپنا منشور اور اپنا اپنا پروگرام لے کر ملک میں پروپیگنڈہ شروع کرے اور اس طرح عوام کی اکثریت کو

اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرے۔ جو پارٹی کامیاب ہو جائے اسی کا پروگرام مملکت میں نافذ ہو جائے۔

آپ ذرا تصور میں لائیے ایسے منظر کو کہ ملک میں ایک آئین تو نافذ کر دیا جائے لیکن یہ طے نہ ہو کہ اس آئین کو چلانے گی کونسی پارٹی۔ اس مقصد کے لئے مختلف سیاسی پارٹیاں ملک میں جلسے، جلوس، مظاہرے، تقاریر، پمفلٹ، اشتہارات، الزامات، طعن، تشنیع، گالی، گلوچ کے ذریعے عوام کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں مصروفِ کار ہو جائیں ــــ ملک کی سیاسی پارٹیاں اور ان کے لیڈر اس "جہاد" میں مصروف ہوں اور اس دوران میں ملک جائے جہنم میں! آپ ذرا سوچئے کہ اس سے اس (بدنصیب) ملک کا انجام کیا ہوگا؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض لوگوں کو کوئی مکان ناپسند ہو۔ ان میں سے پانچ سات فریق اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اسے گرا دیا جائے۔ جب وہ مکان گر جائے تو پھر ان میں سے ہر فریق اس کوشش میں لگ جائے کہ اس زمین پر اس کا قبضہ ہو جائے تاکہ وہ اس پر اپنی منشاء کے مطابق مکان تعمیر کر سکے۔ اس مقصد کے لئے ہر فریق اس گاؤں کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے ــــ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس طرح (اس مکان کا تو جو حشر ہونا تھا وہ ہو چکا، خود) اس گاؤں کا کیا حشر ہوگا؟

یہ ہے تحریکِ جمہوریت کا مقصد! یعنی ان پارٹیوں کے اتحاد کا جذبہ محرکہ (محاورہ کے الفاظ میں) صرف "بغضِ معاویہؓ" ہے "حبِّ علیؓ" نہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف تخریب ہے۔ کسی نے پوچھا تھا کہ اس گاؤں میں کوئی "بونا" (چارپائیاں بُننے والا) بھی ہے۔ جواب ملا کہ یہاں بونا تو کوئی نہیں البتہ دو بھائی "ادھیڑو" ضرور رہتے ہیں۔ تحریکِ جمہوریت صرف ادھیڑوں پر مشتمل ہے۔ ان میں بونا کوئی نہیں۔ اس کے پیشِ نظر صرف لا ہے۔ اِلّا پر کوئی متفق نہیں۔ ان حضرات کا باہمی اتحاد ایسا ہی ہے جیسے ہمارے مذہبی فرقے کسی مسلمان کی تکفیر (کفر کا فتوےٰ صادر کرنے) پر سب متفق ہو جایا کرتے ہیں، لیکن اگر کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانا ہو تو سب ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ مسلمان ہونے والا اس کے فرقے میں شامل ہو۔

یہ ہے تحریکِ جمہوریت کا مقصد!

۲۔ جو عوام کہیں وہ حق ہے

مودودی صاحب کی تقریر کا جو اقتباس شروع میں دیا گیا ہے اس میں سارا زور اس پر صرف کیا گیا ہے کہ ملک کا وہی نظام صحیح اور کسی جماعت کا وہی پروگرام درست سمجھا جا سکتا ہے جسے ملک کے عوام صحیح اور درست سمجھیں ــــ یوں بھی مغربی جمہوریت کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس نظام پر ملک کے عوام رضامند ہوں وہی نظام درست سمجھا جائے ــــ مودودی صاحب اب کچھ عرصہ سے اسی جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ بلکہ اسے عین مطابقِ اسلام

قرار دے رہے ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ اس سے پہلے عوام کے متعلق ان کی رائے کیا تھی ـــــ انہوں نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی محرم الحرام ۱۳۶۰ھ کی اشاعت میں لکھا تھا۔

> یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں' نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا، نہ باطل کو باطل جان کر اُسے ترک کیا ہے ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگ دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

چڑیا گھر

انہوں نے ترجمان القرآن کی ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کی اشاعت میں تحریر فرمایا تھا۔

> غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہیں کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، تیتر، بٹیر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

> یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں' اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

جب جماعتِ اسلامی سے متعلقین کے سامنے ان کے سربراہ کی یہ تحریریں رکھی جائیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں ـــــ لیکن سنیئے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی' اس قوم کے متعلق مودودی صاحب کی رائے کیا تھی ـــــ اور وہ رائے کچھ پہلے کی نہیں۔ خود اسی پمفلٹ میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ گورنر جنرل (غلام محمدؒ مرحوم) نے جب وزیر اعظم کو برطرف کر کے دوسرا وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> اس کے بعد یہ عجیب منظر دیکھا گیا کہ گورنر جنرل ایک آدمی کو پکڑ کر پارلیمنٹ کی اکثریتی پارٹی کے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ اب یہ تمہارا لیڈر ہے۔ اور وہ پارلیمنٹ' پوری بزدلی یا سخت بے شعوری کے ساتھ اس کو اپنا لیڈر مان لیتی ہے ..... (اس طرح) اس موقع پر ہماری ساری ہی

قومی کمزوریوں کا راز فاش ہوگیا ۔ (ص۸۲)

اس کے بعد لکھتے ہیں ۔

کیا آپ اس کی کوئی وجہ قومی کیریکٹر کے فقدان کے سوا کچھ اور بتا سکتے ہیں ۔ (ص۸۳)

آگے چل کر کہتے ہیں ۔

ہمارے افراد کو، جن میں بڑے بڑے عالی مقام لوگ شامل ہیں، کوئی ایسی تعلیم و تربیت نہیں ملی جس نے ان میں کوئی قومی کیریکٹر پیدا کیا ہو ..... اور آپ بُرا نہ مانیں تو میں کہوں کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل تو کر لی مگر ہمارے اندر قومی حیثیت سے وہ ابتدائی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوتے ہیں جن کی بدولت کوئی قوم اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہے (ص۸۴)

یہ ہے وہ قوم جس کے متعلق اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جس نظام اور پروگرام کو اس کی اکثریت حق کہہ دے اسے حق تسلیم کر لیا جائے اور جسے یہ مسترد کر دے اُسے باطل قرار دے دیا جائے حتےٰ کہ وہ یہاں تک بھی کہہ گئے ہیں کہ

عقل اور انصاف دونوں اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ملک کا نظام ملک کے باشندوں کی مرضی اور ان کی رائے کے مطابق چلنا چاہیئے۔ کسی شخص کا یہ فرض کر لینا کہ ملک کے کروڑوں باشندے بے عقل اور نا اہل ہیں اور وہی اکیلا ایسا ہے جو عقل اور اہلیت لیکر آیا ہے، یا تو محض بے عقلی ہے، یا پھر بدنیتی کے ساتھ ہی ایسی لغو بات زبان سے نکالی جا سکتی ہے ۔ (ص۸۵)

مودودی صاحب کی تحریروں اور تقریروں کے جو اقتباسات پہلے دیئے جا چکے ہیں، ان کی روشنی میں آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ ملک کے باشندوں کو جاہل، نا اہل، کافرانہ کردار کے حامل، بزدل، سیاسی شعور سے عاری، قومی کردار سے ناآشنا، کس نے قرار دیا ہے؟ اور پھر اسے بھی پیش نظر رکھیئے کہ مودودی صاحب نے آج تک اس کا اقرار نہیں کیا کہ وہ بھی اسی کافرانہ کردار رکھنے والی، جاہل اور نا اہل قوم کے ایک فرد ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس پست کردار کی حامل قوم سے بلند مقام پر سمجھتے ہیں، حتےٰ کہ ان کے نزدیک، اس قوم میں

صالحین صرف یہ لوگ ہیں

صالحین صرف وہ ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں سرگودہا میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس وقت جماعتِ اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے کہ جس کی اس وقت ہمارے ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت کی صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں، سرکاری ملازمین، تاجر اور صنعت پیشہ طبقہ، غرض ہر گروہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے کیریکٹر

ادر کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت کا کوئی کام ان کے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول و قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ قول و قرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں قوم کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابلِ اعتماد سیرت والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابلِ اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔

(بحوالہ الاعتصام۔ بابت ۱۵/۵۵)

اب یہی قابلِ اعتماد سیرت کے حامل حضرات قوم کی اس "عظیم اکثریت" کے فیصلہ کو اپنے لئے حق و صداقت کا معیار قرار دے رہے ہیں جن کی سیرت و کردار میں یہ اس طرح کیڑے ڈالتے تھے ـــــ سیاست کی مصلحت بینیاں اور مفاد پرستیاں انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔

۱۹۵۶ء کا آئین

اس آئین کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے کہا ہے۔

اب مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ ان تمام خرابیوں کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نظام کو تبدیل کر کے یہاں پھر اسی اسلامی جمہوریت کو نافذ کرنے کی کوشش کی جائے جو ۱۹۵۶ء کے دستور میں تجویز کی گئی تھی اور جس کے نفاذ کا راستہ زبردستی مارشل لاء کے ذریعے روک دیا گیا تھا۔ اس دستور کا بنیادی اصول یہ تھا کہ عوام براہِ راست اپنی حکومت کا نظام چلانے والوں کو خود چنیں اور عوام کے بنائے ہوئے لوگوں کو بجٹ اور قانون سازی کے کلی اختیارات حاصل ہوں البتہ ان پر یہ پابندی ہے کہ قانون سازی قرآن و سنت کی قائم کردہ حدود کے اندر کریں اس سے تجاوز نہ کرنے پائیں۔ (ص ۴۲-۴۱)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک۔

(۱) ملک کی تمام خرابیوں کا علاج ۱۹۵۶ء کے آئین کا نافذ کر دینا ہے۔ اور

(۲) اس آئین کے نفاذ سے ملک میں اسلامی جمہوریت قائم ہو جائے گی۔

ہمیں اس وقت نہ تو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر کا تجزیہ مقصود ہے اور نہ ہی جزواً یا اجزواً ان کا باہمی تقابل منظور۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو دعاوی اوپر کئے گئے ہیں، وہ کس حد تک صحیح ہیں۔

پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے نفاذ سے ملک کی ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ملک کی ساری خرابیوں سے قطع نظر، اس وقت سب سے بڑی خرابیاں یہ ہیں کہ (۱) ملک میں (CORRUPTION) عام ہو رہی ہے۔ (۲) دولت کی تقسیم اس قدر ناہموار ہو چکی ہے کہ اوپر کے طبقہ اور نچلے طبقہ میں زمین اور چاند سے بھی زیادہ فاصلہ حائل ہو رہا ہے۔ اور (۳) ملک کی بیشتر آبادی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم ہو رہی ہے اور انہیں بہم پہنچانے کی ذمہ داری کسی کے سر پر نہیں۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں وہ کون سی دفعات ہیں جن سے ان خرابیوں کا علاج ہو سکتا ہے؟ یہ خرابیاں، نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہیں اور جب تک یہ نظام موجود ہے، ان خرابیوں کا ازالہ تو کجا اصلاح تک بھی نہیں ہو سکتی۔ ان کا علاج اس نظام کو بدل کر اس کی جگہ قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ ہے جس میں۔

(۱) تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کی ایسی ذمہ داری قرار پاتی ہے جس کے پورا نہ ہونے پر حکومت سے عدالت میں مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) حکومت اس اہم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے کہ ذرائع پیداوار (خواہ وہ قدرتی ہوں اور خواہ مصنوعی ـــــ بالفاظ دیگر زمین اور کارخانے) افراد کی ملکیت کے بجائے، ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔

(۳) جب ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت میں نہیں رہیں گے تو کسی کے پاس فالتو دولت نہیں ہو گی۔

(۴) اور جب کسی کے پاس فالتو دولت نہیں رہے گی تو طبقات میں خود بخود ہمواری پیدا ہو جائے گی۔ یہ ہمواری اس انسانی مساوات کا ایک عملی گوشہ ہے جسے اسلام قائم کرنے کے لئے آیا تھا۔ (اس کا دوسرا اہم گوشہ احترامِ آدمیت ہے جو قرآن کی متعین کردہ مستقل اقدار کی رُو سے عمل میں آتا ہے۔)

معاشی نظام کے سلسلہ میں جو صورت ۱۹۶۲ء کے آئین کی ہے وہی ۱۹۵۶ء کے آئین کی ہے۔ دونوں نظامِ سرمایہ داری کے حامل، فلہذا غیر قرآنی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا فریب دہی ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین سے ملک کی ساری خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔

اب رہا جمہوریت کا اسلامی ہونا، سو اس سلسلہ میں کہا یہ گیا ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ شق موجود تھی کہ قانون سازی کے اختیارات، کتاب وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے استعمال کئے جائینگے۔ اس ضمن میں جو دفعات ۱۹۵۶ء کے آئین میں تھیں بعینہٖ وہی دفعات، انہی الفاظ میں ۱۹۶۲ء کے آئین میں موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ ملک کا کوئی قانون، قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہو گا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ شق بھی موجود ہے کہ جہاں تک پرسنل لاز (شخصی قوانین) کا تعلق ہے، کتاب وسنت کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہو گی۔ یہ شق یکسر غیر قرآنی اور

دین کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق سرتاسر خلافِ قرآن ہے۔ ہم مودودی صاحب اور ان کے ساتھ ملک کے تمام "علماء کرام" کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ قرآن اور حدیث سے کہیں یہ تفریق ثابت کر دیں یا یہ بتا دیں کہ عہد نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ میں یہ تفریق کی گئی تھی۔ باقی رہے مذہبی فرقے، سو جیسا کہ ہم دوسری جگہ بوضاحت لکھ چکے ہیں، دین میں شرقوں کا وجود بہ نصِ صریح شرک ہے۔

۱۹۶۲ء کے آئین میں پہلے یہ شق نہیں تھی۔ لیکن بعد میں 'خیر سے' مودودی صاحب اور دیگر "حضرات علماء کرام" کی ایجی ٹیشن سے اس میں بھی یہ شق راہ پا گئی۔ اس لئے اس اعتبار سے بھی ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے آئین لفظاً لفظاً ایک جیسے ہیں اور یکساں مردود۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کو اسلامی قرار دینا اور اسی قسم کے ۱۹۶۲ء کے آئین کو غیر اسلامی ٹھہرانا' ابلہ فریبی اور کھلی ہوئی بد دیانتی نہیں تو اور کیا ہے۔

طریقِ انتخاب

اب 'مودودی صاحب کی تقریر میں ایک ہی شق باقی رہ جاتی ہے جس کی رُو سے وہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو اسلامی قرار دے رہے ہیں اور وہ یہ کہ اس میں "عوام براہِ راست اپنی حکومت چلانے والوں کو چُنتے تھے۔"

جہاں تک صدرِ مملکت کے انتخاب کا تعلق ہے ۱۹۵۶ء کے آئین کی رُو سے بھی اسے عوام براہ راست نہیں چنتے تھے۔ عوام' پارلیمان کے اراکین کا انتخاب کرتے تھے اور پارلیمان کے اراکین صدر کا انتخاب۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کی رُو سے 'عوام' بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ ارکان' صدر کا انتخاب۔

البتہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی رُو سے 'عوام' پارلیمان کے اراکین کا انتخاب براہِ راست کرتے تھے لیکن ۱۹۶۲ء کے آئین کے مطابق، اراکین پارلیمان کا انتخاب' بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کرتے ہیں۔

ہم ان حضرات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ کوئی آیت یا حدیث ایسی پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ کہا گیا ہو کہ اگر پارلیمان کے ارکان کو عوام براہِ راست چُنیں تو وہ انتخاب اسلامی ہوگا۔ اور اگر انہیں بنیادی جمہوریتوں کے ارکان چنیں تو یہ طریقِ انتخاب غیر اسلامی قرار پائے گا؟

قانون سازی

اب رہا یہ سوال کہ قانون سازی کے لئے ارکانِ پارلیمان کو کلی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ سو اس سلسلہ میں ہر دو دساتیر میں یہ شق موجود ہے کہ پارلیمان جو مسودہ قانون پاس کرے' اس کی توثیق صدرِ مملکت سے کرانی ہوگی۔ اگر کسی قانون کے بارے میں صدرِ مملکت اور پارلیمان میں اختلاف ہو جائے اور صدرِ مملکت توثیق کے لئے رضامند نہ ہو' تو ۱۹۶۲ء کے دستور میں کہا گیا ہے کہ اسکے متعلق الیکٹورل کالج (منتخبین) سے ریفرنڈم کرائی جائے۔ یہ ہے وہ شق جس کی رُو سے 'مودودی صاحب' اس طریق کو غیر جمہوری فلہذا غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔

آپ نے اس اعتراض کو ملاحظہ فرمالیا۔ اب یہ دیکھئے کہ انہی مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، اسلام کی رُو سے صدر مملکت کو کس قسم کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پمفلٹ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں لکھتے ہیں۔

دو اسلام

جب امیر کو چُن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات حاصل ہونگے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہونگے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا، امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (ص ۴۶-۴۵)

جماعتِ اسلامی نے آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں جو اپنا دستوری خاکہ پیش کیا تھا اس کی دفعہ ۳۶ میں کہا گیا تھا کہ۔

امیر کو مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔ (دو دستوری خاکے ص ۲۸)

آپ نے غور فرمایا کہ ۱۹۶۲ء کے آئین کی یہ شق کہ صدر مملکت اور اراکین پارلیمان کی اکثریت کے اختلاف کی صورت میں، استصواب عام کرایا جائے، مودودی صاحب کے نزدیک غیر اسلامی ہے۔ اور اپنے آئین کی یہ شق کہ امیر کو اس کا بھی حق حاصل ہوگا کہ وہ (اکثریت تو ایک طرف) پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کردے عین مطابقِ اسلام! آپ شاید حیران ہونگے کہ ایک ہی سانس میں یہ "دو اسلام" کیسے؟ لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ان صاحب کے جھولے میں ہر اہم معاملہ کے متعلق، دونوں قسم کے اسلام موجود ہوتے ہیں۔ ایک اسلام اپنے لئے اور دوسرا اسلام فریقِ مقابل کے لئے۔ جس وقت جس قسم کے اسلام کی ضرورت ہو، یہ اسے تھیلے سے باہر نکال لاتے ہیں۔

یہ ہے "تحریکِ جمہوریت" اور یہ ہے اس کی اسلامی حیثیت۔ واضح رہے کہ ہم نہ ۱۹۶۲ء کے آئین کو صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں اور نہ ہی ۱۹۵۶ء کے دستور کو دستاویزِ شیطانی۔ ہمارے نزدیک دونوں میں اچھی باتیں بھی ہیں اور ایسی باتیں بھی جو قرآنِ کریم کی روشنی میں اصلاح طلب، اور قابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ صحیح اسلامی آئین صرف وہ ہوگا جو قرآنی احکام و اصول کے مطابق ہو۔ قرآن، زندگی کے تمام اہم معاملات کے متعلق بنیادی اصول دیتا ہے اور اسے ہر دور کی امت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام و طُرق خود متعین کرے۔ وہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات میں، حالات کے تغیر کے ساتھ، تبدیلی ہوتے رہے گی۔ ثبات و تغیر کے اسی امتزاج سے اسلامی

دستورِ حیات ترتیب پاتا ہے۔ جہاں تک "جمہوریت" کا تعلق ہے قرآن کریم نے ایک اصول عطا کر دیا ہے اور وہ یہ کہ۔ امرھم شوریٰ بینھم۔ (۴۲/۳۸) اس امت کے معاملات باہمی مشورے سے طے پائینگے۔ یہ اصول غیر متبدل ہے۔ اسے بروئے کار لانے کے لئے مشینری کا تعین اس نے خود نہیں کیا۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ اپنے حالات کے مطابق جو طریق مشاورت بھی احسن سمجھے اسے اختیار کرلے۔ آپ کسی طریق مشاورت کی خرابیاں واضح کر کے، اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے طریق کو بدلائل و براہین ثابت کر سکتے ہیں لیکن اپنے تجویز کردہ طریق کو اسلامی، اور فریق مقابل کے طریق کو غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس سے برگشتہ اور اپنے ساتھ متفق کرنے کی کوشش سراسر دھاندلی ہے۔

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے تحریکِ جمہوریت کا یہ فیصلہ آیا کہ آئندہ انتخابات کا مقاطعہ کیا جائیگا۔ اور ملک میں تحریکِ جمہوریت جاری رکھی جائے گی۔ اس سے ہمیں بے حد قلق اور افسوس ہوا۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے، ان حضرات کا منتہیٰ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء کے آئین کی جگہ ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ کیا جائے گا۔ اب انہوں نے یہ کہا ہے کہ اگر انتخابات، براہِ راست بالغ رائے دہندگی کے اصولوں پر ہوں، تو وہ ان میں حصہ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں، موجودہ آئین میں ترمیم کی ضرورت ہوگی۔ موجودہ نظامِ جمہوریت کے تحت، کسی آئین میں ترمیم، یا ایک آئین کی جگہ متبادل آئین کے نفاذ کا جمہوری طریق یہ ہے کہ پارلیمان اس کی منظوری دے۔ اپوزیشن کے لئے، اپنے مقصد کے حصول کا جمہوری طریق یہی تھا کہ وہ انتخابات میں حصہ لے کر، پارلیمان میں اتنی اکثریت حاصل کر لیتے کہ ان کی منشاء کے مطابق آئین میں ترمیم و تنسیخ ہو سکتی۔ اس کے سوا کوئی اور طریق جمہوری ہو نہیں سکتا۔ لیکن انہوں نے اس طریق کو تو مسترد کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہم "تحریکِ جمہوریت" کو جاری رکھیں گے تاآنکہ ہمارا مقصود حاصل ہو جائے۔ پارلیمانی طریقِ جمہوریت کو چھوڑ کر، حصولِ مقصد کے لئے کون سا دوسرا جمہوری طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، آئین پسند ذہنیت تو اسے سمجھ نہیں سکتی۔ مودودی صاحب نے لندن سے واپسی پر کراچی میں اپنی اولین نشست میں اس کا جو جواب دیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے۔

> آئینی ذرائع سے نظام کی تبدیلی کے متعلق ایک سوال کے جواب دیتے ہوئے مولانا محترم نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں کے اندر رہ کر ہی کوششیں کی جائیں بلکہ دنیا بھر میں آئینی ذرائع سے جو مطلب لیا جاتا ہے، ان ذرائع کو اختیار کر کے تبدیلی لائی جائے۔ اور یہ ذرائع موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں

سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ (ایشیا۔ ۵ر جنوری ۱۹۶۹ء)

پارلیمانی جمہوری طریق کے علاوہ، کون سے "آئینی ذرائع" ہو سکتے ہیں، اس کے متعلق، کم از کم ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ اپوزیشن نے جو ذرائع پچھلے دنوں اختیار کئے ہیں، اگر انہیں آئینی اور جمہوری کہا جا سکتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر غیر آئینی اور غیر جمہوری ذرائع کون سے کہلا سکتے ہیں؟ ان ذرائع کے نتیجہ میں ہلڑ بازی، آتش زدگی۔ توڑ پھوڑ۔ املاک کی تباہی، کاروباری نقصانات، طالب علموں کی تعلیم کے ہرج (وغیرہ) کے علاوہ اور کیا چیز سامنے آئی۔ دوسری طرف، ان تخریبی نتائج کی روک تھام کے لئے، انتظامیہ کو جو کچھ کرنا پڑا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ (اس میں ان سے حماقتیں بھی ہوئیں اور بعض مقامات میں زیادتی بھی۔ اس قسم کے حالات میں ایسا ہونا بدیہی ہے)۔ لہٰذا، اگر اپوزیشن نے اپنی تحریک کو عوامی بنانے کے لئے اس قسم کے ذرائع اختیار کرنے ہیں، تو پھر اس (بدنصیب) مُلک کا خدا حافظ! ــــ جب سیاست اس قسم کا رُخ اختیار کر لے تو اس کا آخری نتیجہ "سول وار" کے سوا کچھ نہیں ہوا کرتا ــــ خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے ــــ

اصل یہ ہے کہ اپوزیشن کے پاس نہ تو کوئی مثبت پروگرام ہے (کم از کم ان سطور کی تحریر تک ایسا کوئی پروگرام ہمارے سامنے نہیں آیا)۔ اور نہ ہی کوئی ایسی بلند قامت شخصیت جس کا ملک میں عالمگیر احترام ہو ــــ یہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ قوم ایسی بانجھ ہو گئی ہے کہ سارے ملک میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی۔ جب معاشرہ اس طرح کثافت آلود ہو جائے تو جن شخصیتوں میں بلندیٔ قامت کی صلاحیت ہوتی ہے، اُن کے لئے اُبھر کر سامنے آنے کے مواقع ہی نہیں ہوتے۔ یہی وہ یاس انگیز ماحول ہوتا ہے جس میں قوم اپنے لئے اس قسم کے دل خوش کن تصورات کو جینے کا سہارا بنا لیتی ہے کہ ــــ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند ــــ یہ زندہ قوموں کے آثار نہیں ہوتے۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اپوزیشن کے پاس نہ کوئی مثبت پروگرام ہے، اور نہ کوئی بطلِ جلیل ــ ان حالات میں، ان کے سامنے اس کے سوا کوئی اور پروگرام آ ہی نہیں سکتا کہ ملک کے انتظام کو درہم برہم کر کے حکومت کو مجبور کر دیا جائے کہ ان کے (جائز و ناجائز) مطالبات کو منظور کر لے۔ کیا اس کا نام جمہوری طریق ہے؟ ہم ان حضرات سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ برسرِ اقتدار ہوں تو کیا وہ ایسی صورتِ حالات کو پسند اور گوارا کر لیں گے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب مسٹر گاندھی نے ہندوستان میں عام سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو اس نے قائداعظمؒ سے کہا کہ چونکہ ملک سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے مسئلہ پر وہ بھی متفق ہیں، اس لئے وہ اس تحریک میں ان کا ساتھ دیں۔ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں اُن سے کہا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کی اطاعت سکھایئے۔ سرکشی اور نافرمانی کا سبق نہ پڑھایئے۔ اسے آپ نے "نافرمانی" کا عادی بنا دیا تو آج یہ انگریزی قانون کی نافرمانی کرے گی اور کل کو (جب آپ کی

حکومت قائم ہوگی تو) آپ کے احکام کی بھی نافرمانی کرے گی۔ ہم تحریکِ جمہوریت کے علمبرداروں کی خدمت میں، دل کے پورے درد اور سوز کے ساتھ، یہی گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ قوم کو آئین کے احترام کا عادی بنائیں اور جس آئین کو وہ غلط سمجھتے ہیں اسے بدلنے کے لئے پارلیمان کا جمہوری طریق اختیار کریں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں قرآنی آئین نہ ۱۹۶۲ء کا ہے نہ ۱۹۵۶ء کا کہ ایک کے احترام سے کفر لازم آجائے۔

اس ضمن میں حکومت کو کیا کرنا چاہیئے، اس کے لئے ہم اسی اشاعت کے لمعات میں اپنی گزارشات پیش کرچکے ہیں۔ (محررہ - ۹ جنوری ۱۹۶۹ء)

زندگی کے بنیادی مسائل حل کرنیکے سلسلے میں

عقلِ انسانی آج تک کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو

پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی!

ہزاروں کتابوں کا نچوڑ، افلاطونِ اعظم سے لیکر آجتک گذشتہ اڑھائی ہزار برس میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین اور علمائے اخلاقیات وعمرانیات اور ماہرینِ معاشیات وسیاسیات نے کیا کچھ سوچا۔ اسے پڑھیئے اور اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھیئے کہ انسان کو

وحی کی ضرورت کیوں ہے؟

اعلیٰ درجہ کی طباعت کی کتابت | عمدہ سفید کاغذ | قیمت مجلّد - بارہ روپے

ناظم - ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

جوانوں کو مری آہِ سحر دے!

انسانی زندگی حوادث کا مجموعہ ہے اور ان حوادث میں اکثر الم انگیز اور درد آلود ہوتے ہیں۔ لیکن اگلے دنوں کراچی میں جو حادثہ رونما ہوا ہے، ہمارے نزدیک، پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالمِ اسلام میں، بلکہ اسلام کی ساری تاریخ میں، اس سے زیادہ الم انگیز اور قیامت خیز حادثہ شاید ہی کہیں اور کبھی رونما ہوا ہو۔ حادثہ یہ تھا کہ مسلمان نوجوانوں نے، کسی بات پر مشتعل ہو کر، "اسلام مردہ باد" کے نعرے لگائے۔ ہم نے جب اخبارات میں یہ جانسوز اور ہوش رُبا خبر پڑھی تو یقین مانیئے، ہم پر سناٹا چھا گیا اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابھی تک ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارا دلِ حزیں طلسمِ پیچ و تاب بن رہا ہے اور اس وقت، جب یہ سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں، ہماری رُوح کپکپا رہی، اور ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ حادثہ ہے ہی ایسا دلگداز اور جگر سوز کہ اس سے جسقدر بھی کسی قلبِ حساس کو صدمہ ہو، کم ہے۔

لیکن اس حادثہ پر ماتم کرنے کے بجائے ضرورت ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ایسا ہوا کیوں ہے، اور وہ کون سے محرکات ہیں جن کی بنا پر خود مسلمان گھرانوں کے یہ چشم و چراغ، اس قسم کے نعروں تک آ پہنچے ہیں۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ سوشلزم کے حامیوں اور جماعتِ اسلامی سے وابستگان میں ایک تصادم ہوا۔ اور اس میں اول الذکر کی طرف سے یہ الم انگیز نعرے بلند ہوئے۔

قارئین طلوعِ اسلام اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ہم بیس سال سے مسلسل چلاتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جس قسم کا اسلام پیش کیا جا رہا ہے، اس سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں اسلام کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال اسی طرح جاری رہی اور ہم نے اپنے نوجوانوں کو صحیح دین سے روشناس نہ کرایا، تو خطرہ ہے کہ جس طرح مغرب کی نژادِ نو نے مذہب کا لبادہ اتار پھینکا ہے، ہمارے ہاں کے نوجوان بھی مذہب سے برگشتہ ہو کر اسلام سے سرکشی پر اُتر آئیں گے ـــــ ہم اپنی اس پکار کو برابر دہراتے رہے لیکن ہمارے قدامت پرست طبقہ نے، بجائے اسکے

کہ وہ اس پر غور کرتے، ہمیں تکفیر و تفسیق کے فتووں سے نوازا۔ اور جی میں خوش ہو گئے کہ اس "فتنہ" کی سرکوبی کر دی گئی ہے۔ انہوں نے اتنا نہ سوچا کہ اس سے انہوں نے اس "فتنہ" کی سرکوبی نہیں، اس کی مزید پرورش کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ہم نے اربابِ حکومت کی خدمت میں گزارش کیا ـــــ اور بہ تکرار و اصرار گزارش کیا ـــــ کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو کچھ اسلامیات کے نام سے پڑھایا جا رہا ہے، اس سے بچوں اور نوجوانوں کے سامنے اسلام کی بڑی مضحکہ انگیز اور خلافِ عقل و بصیرت تصویر آتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اسلام سے برگشتہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس قسم کی "اسلامیات" سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ان طالب علموں کو مذہب کی تعلیم ہی نہ دی جائے۔ اس سے وہ اسلام سے بیگانہ رہیں گے ـــ اس سے متنفر نہیں ہونگے۔ ہم اپنی اس پکار کو بھی برابر دہراتے رہے لیکن اربابِ اقتدار میں سے کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

دوسری طرف ہم نے سوشلزم کے حامیوں سے کہا کہ وہ سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کی اصطلاحات استعمال نہ کریں۔ روس یا چین کی (کمیونزم یا) سوشلزم عبارت ہے (۱) اس فلسفۂ حیات سے جس میں خدا، وحی، رسالت، آخرت، سب کا انکار ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی، آمیزۂ آب و گل سے زیادہ کچھ نہیں رہتی۔ اور (۲) اُس معاشی نظام سے جس میں ذرائع پیداوار اور وسائل دولت، انفرادی ملکیت کے بجائے، مملکت کی ملکیت میں رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب سوشلزم کو ان ہر دو اجزاء کا مجموعہ تصور کر لیا جائے تو یہ اسلام کی رُو سے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہاں کے سوشلزم کے حامی، درحقیقت مؤید تو ہیں سوشلزم کے معاشی نظام کے، لیکن وہ نوجوانوں کے سامنے دعوت پیش کرتے ہیں سوشلزم کی۔ اس سے ہمارا نوجوان طبقہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سوشلزم کا معاشی نظام اسی صورت میں بروئے کار آ سکتا ہے جب خدا، وحی، رسالت، آخرت سے انکار کیا جائے۔ دوسری طرف ہماری مذہبی پیشوائیت اسلام کا جو معاشی نظام پیش کرتی ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس سے نوجوانوں کے دل میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ خدا، وحی وغیرہ پر ایمان کا لازمی نتیجہ نظامِ سرمایہ داری ہے۔ اس لئے وہ اسلام سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

معاشرہ میں قدامت پسندی اور پیر پرستی کا فروغ، تعلیم گاہوں میں اسلامیات کی وہ تعلیم جو عقل و بصیرت کے چراغ گُل کر دے اور سوشلزم کے فلسفۂ حیات کو مردود قرار دیئے بغیر اس اصطلاح کا عام استعمال اور اس کا پراپیگنڈہ ـــ یہ ہیں وہ عوامل جن کے فطری نتیجہ کے طور پر اسلام کے خلاف نفرت اور سرکشی کے جذبات نوجوانوں کے دل میں پرورش پاتے چلے گئے۔ وہ اس وقت تک ان جذبات کو اپنے سینہ کے آتشدانوں میں دبائے ہوتے تھے اور سوسائٹی کے عام دباؤ سے انہیں برملا زبان تک لانے کی جرأت نہیں

کرتے تھے۔ (اگرچہ ان کی نجی محفلوں میں اس کا چرچا عام ہوتا تھا)۔ کراچی کے تصادم نے جو جذبات کو مشتعل کیا۔ اور یہ تصادم ہوا اس جماعت کے ساتھ جو ایک طرف اسلام کی اجارہ ہونے کی مدعی ہے اور اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ دار کی سب سے بڑی حامی ـــــ تو اس سے یوں سمجھیے کہ ہانڈی کے اوپر سے ڈھکنا اُٹھ گیا اور جو کچھ سینوں میں اُبل رہا تھا، بے اختیار باہر آگیا۔ یہ ہے ہمارے نزدیک اس صورتِ حال کا تجزیہ جو کراچی کے جگر پاش حادثہ کی شکل میں سامنے آیا۔ ہمیں اس حادثہ سے جس قدر صدمہ ہوا ہے، اس کے متعلق ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اور گہرا صدمہ اس احساس سے ہو رہا ہے کہ وہ جو نوجوانوں کے دل میں ایک حجاب سا چلا آرہا تھا، اس بیباکی نے اسے اُٹھا دیا، اور اب معلوم نہیں کہ یہ طوفان کہاں جا کر رُکے۔

ہم اس باب میں نہ تو کچھ قدامت پسند طبقہ سے کہنا چاہتے ہیں کہ

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!

اور نہ ہی اربابِ اقتدار سے کچھ مزید عرض کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں، بالخصوص اس لئے کہ

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

ہم اپنی قوم کے ان نونہالوں سے عرض کرینگے کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اسلام کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے، اسے حقیقی اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کا اسلام ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے جس میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ حاصل تھا۔ صحیح اسلام، اس کے ضابطۂ حیات، قرآن کے اندر ہے۔ اور قرآن کا معاشی نظام، سوشلزم کے معاشی نظام سے بھی آگے جاتا ہے۔ لیکن سوشلزم کے فلسفۂ حیات میں وہ توانائی نہیں جو سوشلسٹک نظام کی اتنی وزنی عمارت کا بوجھ اُٹھا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ چند قدم چل کر روس کو اس نظام میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں کہ چین اسے بدعتی کہہ کر پکارتا ہے۔ چین اپنے تجربہ کے اعتبار سے ابھی اس مقام پر ہے جس مقام پر روس آج سے پچاس سال پہلے تھا۔ اس لئے اس کے مستقبل کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن چونکہ فلسفۂ حیات اس کا بھی وہی ہے جو روسی سوشلزم کا تھا، اس لئے وہ بھی روس جیسے انجام سے بچ نہیں سکیگا۔ لیکن، خواہ روس اور چین دونوں ناکام رہ جائیں، دنیا میں اب نظامِ سرمایہ داری قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا میں مستقبل کا نظام کمیونزم کا وہ معاشی نظام ہوگا جس کی عمارت قرآنِ کریم کی مستقل اقدارِ انسانیت کی محکم بنیادوں پر استوار ہوگی۔ لہٰذا، آپ کو تو سب سے آگے بڑھ کر "اسلام زندہ باد" کہنا چاہیئے۔ جس معاشی نظام کا تصور آپ کے ذہن میں ہے، اسے صرف قرآنی اسلام لا سکتا ہے۔ اس اسلام میں نہ تو شخصی اقتدار باقی رہتا ہے، نہ مذہبی پیشوائیت۔ نہ جاگیرداری باقی رہتی ہے نہ سرمایہ داری۔

اس میں پیداوار اور دولت، جملہ افراد کی نشو ونما کا ذریعہ ہوتے ہیں، نہ کہ چند گھرانوں کے لئے سامانِ تعیش بہم پہنچانے کا موجب۔ اسے ہم (سوشلزم سے متمیز کرنے کے لئے) نظامِ ربوبیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں جس کے معنی ہیں وہ نظام جو عالمگیر انسانیت کی نشو ونما کا ذمہ دار ہے۔ ان صفحات میں اس نظام کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں، نہ ہی اس امر کی وضاحت کی گنجائش کہ یہ نظام کس طرح سوشلزم کے نظام سے زیادہ محکم اور پائیدار بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اگر آپ ان تفاصیل سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم مشورہ دیں گے کہ آپ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ـــــ خدا اور سرمایہ دار ـــــ کا مطالعہ کریں۔ ہمیں امید واثق ہے کہ اس کے بعد آپ نہ صرف یہ کہ کبھی "اسلام مردہ باد" کے جگر پاش الفاظ زبان پر نہیں لائینگے، بلکہ اسلام کے احیاء کے لئے خدا کے سپاہی بن جائینگے، کہ اسی اسلام سے پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا سے سرمایہ داری کے نظام کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

خدا کرے کہ ہماری یہ آواز، ان نونہالانِ ملت کے قلبِ سعید تک رسائی حاصل کر لے ـــــ

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو!

بقیہ قانونی مشورے۔ صفحہ ۱۶ سے مسلسل

کے ہاں سے منگا لئے جائیں اور ان کا اندراج خود کر لیا جائے۔ اس کے بعد دو پریت رجسٹرار کو واپس دے دیئے جائیں کہ وہ انہیں درج رجسٹر کر لے۔ (انہیں اپنے سامنے درج رجسٹر کرائیے۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرے تو اسکی رپورٹ چیئرمین یونین کونسل سے کیجئے۔)

(۲) کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ فریقین کی منشاء کے خلاف اندراجات میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔

(۳) اگر مولوی صاحب اس کالم کو خلافِ شریعت سمجھتے تھے تو وہ اس نکاح خوانی کے لئے تشریف ہی کیوں لاتے۔ یہ حضرات نکاح خوانی کا "ہدیہ" وصول کرنے کے لئے تو جھٹ سے آجائینگے لیکن اندراجات کو خلافِ شریعت قرار دیں گے۔ ان صاحب سے کہنا چاہیئے تھا کہ وہ اس قسم کی تحریر لکھ کر دیں کہ یہ کالم خلافِ شریعت ہے۔ پھر ان کی اس تحریر کو ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس بھیجد ینا چاہیئے تھا۔ وہ خود ان سے نپٹ لیتے۔

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، ان لوگوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ ان کی شریعت نے خاوند کو اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ حقِ طلاق بیوی کو تفویض کر دے۔ اس لئے (ہر چند اس قسم کی تفویض کا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میاں بیوی دونوں کو یکساں نکاح فسخ کرنے کا حق دیتا ہے) یہ کالم ان کی شریعت کے بھی مطابق ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ـــــ کارِ ملا فی سبیل اللہ فساد!

(یہ جواب طلوعِ اسلام کی طرف سے دیا گیا ہے!)

قانون سازی اور علمائے کرام

تشکیلِ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس مملکت میں اسلامی نظام رائج کیا جا سکے اور نظام اپنی عملی شکل میں، قوانین کی رُو سے بروئے کار آتا ہے۔ بالفاظ دیگر، کسی مملکت کا آئین ان اصولوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جن کے مطابق وہ مملکت وجود میں آتی ہے اور مملکت کے قوانین ان اصولوں کی عملی تعبیر کرتے ہیں۔ بنابریں، قیامِ پاکستان کے بعد سب سے اہم سوال، مملکت کے لئے آئین وضع اور قوانین مرتب کرنے کا تھا۔ صدرِ اوّل کے بعد (کہ جب امت میں فرقوں کا وجود نہیں تھا) ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع آیا تھا کہ کسی مملکت نے یہ طے کیا ہو کہ مملکت کے قوانین اسلامی ہوں۔ یعنی ایسے قوانین جن کا اطلاق مملکت میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتوں میں اس فرقہ کا قانون نافذ ہوتا تھا جس سے مملکت کے اربابِ اقتدار منسلک ہوتے تھے۔ اور چونکہ باستثنائے چند، مسلمانوں کی مختلف سلطنتوں میں اربابِ اقتدار حنفی العقیدہ ہوتے تھے، اس لئے عام طور پر ان سلطنتوں میں فقہ حنفی مملکت کا قانون قرار پاتی تھی۔ اقلیتی فرقوں کے لئے اتنی رعایت رکھ دی جاتی تھی کہ شخصی معاملات میں وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق فیصلے کر لیا کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال، اسلام کے منشا کو پورا نہیں کرتی تھی۔ سب سے پہلے تو یوں کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق ہی غیر اسلامی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کسی فرقہ کو (خواہ اس کے ماننے والے کتنی ہی اکثریت میں کیوں نہ ہوں) اس کا حق کیسے پہنچ سکتا ہے کہ وہ اقلیت کے فرقہ سے اپنی فقہ منوائے۔ اکثریت کے فیصلوں کو ملک کا قانون قرار دینا، مغربی جمہوریت کی رُو سے تو صحیح قرار پا سکتا ہے، اسلامی اصول قرار نہیں پا سکتا۔ اسلام میں، صحیح اور غلط۔ حق اور باطل کا معیار، وہ ابدی حدود ہیں جنہیں خدا نے (بذریعہ وحی) متعین کر دیا ہے، نہ کہ اکثریت (یا اقلیت۔ یا کسی ایک فرد) کے فیصلے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ایسے ملک میں جس میں مسلمانوں کے مختلف فرقے بستے ہوں، ایک ایسے ضابطہ قوانین کا مرتب کرنا جس کا اطلاق (اسلامی قوانین کی حیثیت سے) تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، نہایت نازک اور مشکل مسئلہ تھا۔ ہم

نے اس کا حل یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں 'ایک (اور صرف ایک) چیز بطور قدر مشترک موجود ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب — قرآن کریم — کی ابدیت اور محکمیت پر ایمان — اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآن کریم میں بیان کردہ احکام و اصول کے خلاف ہو' تو یہ چیز تمام فرقوں کے لئے وجہ جامعیت بن سکے گی۔ ہماری طرف سے پیش کردہ یہ حل' قرآنِ کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھا جس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ — وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' وہی کافر ہیں۔ اسی کو خدا نے تفرقہ مٹانے کا واحد علاج بتایا تھا جب کہا تھا کہ — وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) تم سب کے سب' اس ضابطۂ خداوندی کے ساتھ متمسک رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس قرآنی حل کی مخالفت ہوئی اس لئے کہ فرقوں کے مٹ جانے سے ان کا الگ الگ وجود ختم ہو جاتا تھا اور وہ چاہتے ہی نہیں کہ امت میں وحدت پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ تجویز کیا کہ قانون سازی کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ

(۱) ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور

(۲) شخصی قوانین میں ہر فرقہ کی کتاب و سنت کی اپنی اپنی تعبیر ہوگی۔

اس پر ہم نے گزارش کیا کہ (قطع نظر اس کے کہ شخصی اور ملکی قوانین کی یہ تفریق ہی سراسر غیر اسلامی ہے) اس اصول کے ماتحت، کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکیگا جس پر تمام فرقے متفق ہو سکیں۔ اسلئے کہ ہر فرقہ کا دعوےٰ یہ ہے کہ اس کی فقہ عین مطابق "سنت" ہے۔ بنا بریں' آپ جو قانون بھی مرتب کریں گے' وہ فرقہ اسے خلافِ کتاب و سنت قرار دے دیگا جس کی فقہ اس قانون کی تائید نہیں کرے گی۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن چونکہ وہ فرقوں کو مٹانا نہیں چاہتے تھے' اسلئے انہوں نے اپنے قدیم حربہ سے کام لیا اور طلوع اسلام کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ منکرِ حدیث' منکرِ سنت اور منکرِ رسالت ہے۔ چونکہ حدیث یا سنت کا تعلق امت کے نازک ترین گوشہ سے ہے' اسلئے ان کا یہ پراپیگنڈہ کارگر ہو گیا اور اصل سوال اس شور و غوغا میں گم ہو کر رہ گیا۔

اس گروہ کے سیاسی مہرہ بازوں نے (جن میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے) اس صورتِ حال سے یہ فائدہ اٹھایا کہ جو حکومت برسرِ اقتدار آئی اس کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتی۔ یہ لوگ مسلسل یہی شور مچاتے رہے اور ہم مسلسل یہ کہتے رہے کہ ان کے اس اعتراض کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ان سے کہا جائے کہ آپ تمام حضرات مل کر ایک ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر دیجئے جسے

تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ اسی ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دیا جائے گا۔ مقامِ اطمینان ہے کہ (بیس برس کے بعد ہی سہی) یہ بات اربابِ حکومت کی سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ صدر مملکت (محمد ایوب خان) نے، ۳۰ر دسمبر کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ صدر نے کہا کہ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح کہ خدا اور رسول کی منشاء تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ صدر نے کہا۔ کہ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء، اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اس قانون کے حق میں عوام کی تائید بھی حاصل کریں اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں اور اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔
>
> (نوائے وقت۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں اگر ان حضرات کا مطالبہ خلوص اور دیانت پر مبنی ہوتا تو انہیں صدرِ مملکت کی اس پیشکش پر آگے بڑھ کر لبیک کہنا چاہیئے تھا۔ آپ غور فرمایئے کہ اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات اور کوئی ہو سکتی ہے کہ سربراہِ مملکت خود دعوت دے کہ آپ حضرات ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر دیں۔ صدر مملکت نے طریق کار کے سلسلہ میں جو اور تجاویز پیش کی ہیں، ان کے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کرائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ علماء کرام کو صدر مملکت کا یہ چیلنج فوراً قبول کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ قبول تو اس صورت میں کرتے جب انہیں یقین ہوتا کہ اس قسم کا متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ہزار برس سے یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں یا باندھنے چاہئیں اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس مقام پر۔ کیا وہ لوگ مملکت کے لئے متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کر سکتے ہیں؟ کتاب و سنت کے متعلق متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنا تو ایک طرف، ہم انہیں برسوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ آپ حضرات متفق طور پر یہ بتا دیجئے کہ "سنت" کہتے کسے ہیں اور یہ کونسی کتاب میں ملے گی۔ ان کے پاس اس کا جواب بھی سوائے

گالیوں کے کچھ نہیں۔

بہرحال صدرِ مملکت کی اس پیشکش کے جواب میں ان کی طرف سے جس بوکھلاہٹ کا مظاہرہ ہوا ہے اس سے ان کے بادبانوں سے ہوا نکل گئی ہے اور یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آگئی ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہوتا، تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قانون سازی کا جو اصول یہ حضرات پیش کرتے ہیں، اس کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صدر مملکت کی اس پیشکش کے خلاف، چند ایک مولوی صاحبان کے سوا، کسی نے لب کشائی تک نہیں کی۔ سب نے چپ سادھ لی ہے۔ اسلئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔ جنہوں نے جواب دیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے یا تو ان شرائط کو ہدفِ اعتراض بنایا ہے جو صدرِ مملکت کیطرف سے عاید کی گئی ہیں اور یا یہ کہا گیا ہے کہ فلاں فلاں قانون (مثلاً عائلی قوانین یا خاندانی منصوبہ بندی) کے خلاف علماء نے اعتراض کیا تھا۔ انہیں کیوں نہیں منسوخ کیا گیا۔ اس کا دعویٰ کسی ایک کی طرف سے بھی نہیں کیا گیا کہ اگر صدر ان شرطوں میں فلاں فلاں تبدیلی کر دے تو ہم اس قسم کا متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ان جوابات میں البتہ ایک چیز بطور قدرِ مشترک سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۱ء میں اکتیس علماء نے (جن میں ہر فرقہ کے نمائندگان شامل تھے) بائیس نکات پر مبنی ایک مسودۂ سفارشات پیش کیا تھا۔ ایسے متفق علیہ مسودہ کی موجودگی میں، ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کا مطالبہ چہ معنی دارد! اس جواب سے عوام کو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ غلط ہے کہ فرقوں کا وجود، متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنے کی راہ میں حائل ہے۔ مختلف فرقوں کے علماء تو ۱۹۵۱ء میں متفق ہو چکے تھے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ

> سب سے پہلے تو انہوں نے (یعنی صدر مملکت نے) مسلمانوں کے مذہبی تفرقوں کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہی چیز اسلامی قانون کے نفاذ میں مانع ہے۔ حالانکہ جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون، شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لاز (یعنی ان کی اپنی فقہ) کے مطابق کئے جائینگے۔ اس لئے شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹ عائد ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دور کی جا چکی ہے اور اب ان اختلافات کو نفاذِ شریعت میں مانع قرار دینے کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔

(نوائے وقت ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

واقعی یہ دعوے بہت بڑا ہے۔ اور اگر ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے علما کسی ضابطۂ قوانین پر متفق ہو چکے تھے تو آج ان کے اختلافات کو نفاذِ قانون کے راستے میں رکاوٹ قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ لہٰذا آیئے ہم دیکھیں کہ ۱۹۵۱ء میں یہ حضرات کس بات پر متفق ہوئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اواخر جنوری ۱۹۵۱ء میں مولوی صاحبان کی ایک کانفرنس، زیر صدارت سید سلیمان ندوی (مرحوم) منعقد ہوئی تاکہ دستور پاکستان کے بنیادی اصول مرتب کئے جائیں۔ اس کانفرنس میں اکتیس مولوی صاحبان نے شرکت کی جن میں اہل فقہ، اہل حدیث، شیعہ حضرات اور کچھ پیر صاحبان بھی شامل تھے۔ ان کی طرف سے اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کے عنوان سے ایک مسودہ شائع ہوا تھا۔ اسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصولوں کی تصریح لازمی ہے:۔

(۱) اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

(۲) ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکیگا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائینگے۔

(۳) مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

(۴) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے اُبھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملّتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

(۶) مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ، اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(۷) باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ یعنی حدودِ قانون

کے اندر تحفظِ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

(۸) مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائیگا۔ اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعہ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دیجائیگی۔

(۹) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہونگے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(۱۰) غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۱) غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ مملکت سب برابر کے شریک ہوں گے۔

(۱۲) رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا انکے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

(۱۳) رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(۱۴) رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکان اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

(۱۵) رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

(۱۶) جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

(۱۷) رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

(۱۸) ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا۔ اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اسکو نافذ کرینگی۔

(۱۹) محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہئیتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

(۲۰) ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

(۲۱) مملکت کے مختلف ولایات و اقطاع مملکتِ واحدہ کے اجزاءِ انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی، یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ مسودہ مملکت کے آئین کے اصولوں سے متعلق ہے۔ اور اس وقت بات ایک ضابطۂ قوانین کے مرتب کئے جانے کی ہو رہی ہے۔ آئین و قوانین میں جو بنیادی فرق ہے اسے ہر صاحبِ شعور جانتا ہے۔

پھر یہ دیکھئے کہ اس میں قوانین سازی کا وہی اصول دیا گیا ہے جو ۱۹۶۲ء کے آئین میں موجود ہے۔ یعنی ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ اصول بیشک متفق علیہ ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس اصول کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین بھی مرتب کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، "سنت" کا مفہوم اور تعین ہی تو مختلف فرقوں میں ما بہ النزاع ہے۔ ان علماء نے سنت کے لفظ پر تو اتفاق کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ سنت کے مفہوم اور تعین پر بھی ان کا اتفاق ہے؟ جیسا کہ ہم کئی بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں، سنت کا تعین تو ایک طرف اس کی (DEFINITION) کے متعلق، خود مودودی صاحب اور جمعیت اہلحدیث میں اس قدر اختلاف ہے کہ اہلحدیث حضرات، مودودی صاحب کے پیش کردہ سنت کے مفہوم کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے پر تیار بیٹھے ہیں۔

اس کے بعد حنفی حضرات اور اہلِ حدیث حضرات کو لیجئے۔ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار بھی کفر کا مستلزم ہے، اور حنفی حضرات کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث ناقابلِ تسلیم ہیں۔ اور جن احادیث پر فقہ حنفی کا مدار ہے، اہلحدیث ان میں سے بیشتر سے انکار کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے متعلق، حنفی حضرات کا عقیدہ کیا ہے، اس کی بابت، فقہ حنفی کے ایک مقتدر امام، ابو الحسن عبید اللہ الکرخیؒ کا فتویٰ ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مؤوّل ہے اور یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔
>
> (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی۔ خضری ص ۲۱۰)

پھر سنی (جن میں حنفی، یعنی دیوبندی۔ بریلوی اور اہلحدیث سب شامل ہیں) اور شیعہ حضرات کے اختلاف کا اس سے اندازہ لگائیے کہ سنیوں کے نزدیک جس حدیث کے رواۃ میں کوئی ایک شیعہ راوی ہو، وہ حدیث ناقابلِ قبول قرار

پاجاتی ہے۔اورشیعہ حضرات کے مجموعہ ہائے احادیث' سنی حضرات کے مجموعوں سے بالکل الگ' اپنے ہیں۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جن علماء میں' سنت (یا احادیث) کے صحیح اور غلط ہونے کے متعلق اس قدر باہمی اختلافات ہوں' ان کے متعلق یہ کہنا کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ان سب کا اتفاق ہوگیا تھا۔ اگر کھلی ہوئی فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے ؟

مودودی صاحب نے اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں

تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون' شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔

ہم نے ۱۹۵۱ء کا مسودہ' من وعن اوپر درج کر دیا ہے۔آپ اس کی ایک ایک شق کو دیکھئے اور پھر تلاش کیجئے کہ اس میں کہیں بھی یہ کہا گیا ہے کہ" ملک کا قانون' شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے" آپ دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کس جرأت اور دیدہ دلیری سے غلط بیانی کرتے ہیں ! ۱۹۵۱ء کو تو چھوڑیئے اُس وقت جن اکتیس علماء نے اس مسودہ پر دستخط کئے تھے' ان میں سے حنفی حضرات کو چھوڑ کر باقی حضرات سے پوچھئے کہ کیا وہ اس اصول سے متفق ہیں کہ ملک کا قانون، شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہونا چاہیئے جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔ان سے پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ان کے جواب سے آپکے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔

اور دیگر علماء کو چھوڑیئے۔ہم خود مودودی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شریعت کی جس تعبیر کو مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے، کیا آپ خود بھی اسے کتاب وسنت کی صحیح تعبیر تسلیم کرتے ہیں ؟ خود مودودی صاحب کی تشریح کے مطابق مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت فقہ حنفی کو کتاب وسنت کی صحیح تعبیر مانتی ہے۔اس فقہ کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات کیا ہیں' انہیں ذرا غور سے سنیئے۔ وہ اپنی تالیف' "رسائل ومسائل" (حصہ اوّل) میں لکھتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رح کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھینگے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں۔یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ رح اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں۔ (ص ۲۷۴،۷۵)

وہ' دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسول ؐ روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (تفہیمات حصہ اول ص ۳۲۵)

حنفی مسلک کا مدار تقلید ائمہ فقہ پر ہے۔اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک ایک صاحبِ علم کے لئے تقلید' ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول۔ صفحہ ۲۴۴)

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا ایک مجتہد کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہو سکتا ہے' وہ فرماتے ہیں۔

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علم الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اس لئے اسکے احکام تمام ازمنہ و احوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں۔ مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو' زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۲۲۶)

فقہ حنفی میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اسے مودودی صاحب' وہ جامد اور بے روح مذہبیت قرار دیتے ہیں جسے آجکل اسلام کہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۳۶)

یہ ہیں اس فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات جسے اب وہ ملک کا قانون بنانا چاہتے ہیں اور جس کی سند' وہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت اس کی حامل ہے۔ اس سند (یعنے اکثریت کے مسلک کے برسرِ حق ہونے) کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فیصلہ سن لیجئے۔ وہ محولہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں۔

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلعم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبویؐ کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبیؐ نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو۔ جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (صفحہ ۸۰)

یہ ہے مختصر الفاظ میں اس دعوے کی حقیقت کہ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے علماء' قانون سازی کے مسئلہ پر متفق ہو چکے تھے۔ اس لئے فرقوں کی موجودگی اس میں مانع نہیں ہو سکتی۔

اس ضمن میں ایک اور مغالطہ بھی دیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قانون سازی کا متفق علیہ اصول یہ ہے کہ ملک کا کوئی قانون 'کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور شخصی قوانین کے سلسلہ میں ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کیمطابق عمل کریگا۔ اس سے تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ مختلف فرقوں میں اختلاف صرف شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی حد تک ہے کتاب وسنت کی روشنی میں' پبلک لاز ایسے بنائے جا سکتے ہیں جو تمام فرقوں کے لئے یکساں طور پر قابلِ قبول ہوں۔ یہ دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ پبلک لاز میں بھی مختلف فرقوں میں اس قسم کے اختلافات موجود ہونگے جس قسم کے اختلافات پرسنل لاز میں ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں، اور اس مثال کا انتخاب بھی ہم نے خود نہیں کیا۔ کراچی کے (مولانا) احتشام الحق صاحب نے اپنے بیان میں کیا ہے کہ

کیا ملک میں شراب کو حرام قرار دینے کے بارے میں بھی کوئی فرقہ وارانہ اختلاف موجود ہے

جواب تک خلافِ قانون قرار نہیں دی گئی۔ (نوائے وقت۔ ۳۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

آیئے' ہم دیکھیں کہ کیا اس باب میں بھی مختلف فرقوں میں اختلاف موجود ہے یا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب آپ "شراب" کو از روئے شریعت حرام قرار دینگے تو آپ کو پہلے متعین طور پر بتانا ہوگا کہ "شراب" کہتے کسے ہیں جسے حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شراب کی یہ (DEFINITION) از روئے شریعت ہی متعین کی جائے گی۔ اب دیکھئے کہ اس باب میں مختلف فرقوں کا مسلک کیا ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ بہت سے فرقے موجود ہیں لیکن جہاں تک فقہی احکام کے اختلاف کا تعلق ہے' بڑے بڑے فرقے یہ ہیں۔ (۱) حنفی۔ (۲) اہل حدیث۔ (۳) شافعی۔ (۴) شیعہ۔ ان مختلف مذاہب کی طرف سے شراب کی تعریف (DEFINITION) متعین کرنے کے لئے احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جمہور علماء اس باب میں حضور صلعم کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں[1]

كلّ مسكرٍ حرامٌ۔ ہر نشہ والی چیز پینی حرام ہے[2]

پھر اس کی تفصیلات میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔

عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال من الحنطة خمرٌ ومن الشعير ومن التمر خمرٌ ومن الزبيب خمرٌ ومن العسل خمرٌ[3]

---

[1] یہ تمام تفصیلات' طلوع اسلام کے دیرینہ کرم فرما، محترم ابوشہاب صاحب کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے اسی سلسلہ میں اشاعت کے لئے ارسال فرمایا ہے اور جس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] المغنی لابن قدامة جلد ۸۔ صفحہ ۳۰۵۔ [3] نیل الاوطار جلد ۷۔ صفحہ ۱۴۸

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ گندم سے بھی شراب ہے اور جَو، کھجور، انگور، شہد سے بھی شراب ہے۔

پھر حضرت عمرؓ سے اس کی تفصیل یوں منقول ہے۔

وقال عمر رضی اللہ عنہ نزل تحریم الخمر وھی من العنب والتمر والعسل والحنطۃ و الشعیر۔ [1]

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کا حکم نازل فرمایا اور یہ شراب انگور سے بھی ہے اور کھجور، شہد، گندم اور جَو سے بھی بنتی ہے۔

چنانچہ ان تفصیلات تک بھی مسئلہ صاف ہے۔ اس لئے اہل حدیث اور جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ

من شرب مسکرًا قلّ اوکثر جلد ثمانین جلدۃ اِذا شربھا وھو مختار لشربھا وھو لعلم انّ کثیرھا یسکر۔ [2]

جس نے اپنے اختیار سے نشہ لانے والی چیز زیادہ مقدار میں یا کم مقدار میں پی اور وہ جانتا ہے کہ اس کی زیادہ مقدار پینے سے نشہ آتا ہے تو اس پر شرعی حد نافذ ہوگی۔ یعنی اس کو اسّی [۸۰] کوڑے مارے جائینگے۔

شیعہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان کی فقہ کی ایک معتبر کتاب تہذیب الاحکام میں ہمیں یہ تفصیلات ملتی ہیں۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال کلّ مسکرٍ من الاشربۃ یجب فیہ کما یجب فی الخمر من الحد۔ [3]

جناب ابوعبداللہ علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز کے پینے سے ویسی ہی شرعی حد واجب ہو جاتی ہے جیسی کہ خمر یعنی شراب کے پینے سے۔

امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ علامہ شوکانیؒ ان کا فیصلہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ

یہ کہ خمر انگور سے بھی ہے اور دوسری چیزوں (یعنی جَو، کھجور، شہد، گندم وغیرہ جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) سے بھی، تو یہ مسلک حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن عمرؓ حضرت ابو موسیٰؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ صحابہ کرام

---

[1] المغنی لابن قدامۃ جلد ۸۔ صفحہ ۳۰۵۔ [2] المغنی لابن قدامۃ جلد ۸۔ صفحہ ۳۰۴۔

[3] تہذیب الاحکام۔ جلد ۱۰۔ صفحہ ۹۰

میں سے ہے اور ان کے علاوہ حضرت سعید بن المسیّب، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور تمام ائمہ اہلحدیث کا یہی مذہب ہے[1]

یہ تو ہے وہ مسلک جو ہمارے ملک میں موجود تین فرقوں یعنی اہل حدیث، شیعہ حضرات اور امام شافعی کے پیروکاروں کا ہے۔ یعنی ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے چاہے اس کی تھوڑی سی مقدار استعمال میں لائی جائے یا زیادہ اور چاہے یہ انگوروں سے تیار کی گئی ہو یا گندم، جو، شہد اور کھجوروں وغیرہ سے۔ اس کے برعکس شراب کی تفصیلات کے بارے میں حنفی مذہب کے احکام مختلف ہیں۔ جنہیں ہم ان کی فقہ کی ایک معتبر کتاب ہدایہ شریف سے نقل کرتے ہیں۔ احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے صرف یہاں کے مطبوعہ ہدایہ کو سامنے نہیں رکھا بلکہ اس کے ساتھ اس کی مشہور شرح فتح القدیر سے بھی اطمینان کر لیا ہے تاکہ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ اب یہ تفصیلات ملاحظہ ہو۔

حنفی مسلک

(۱) و نبیذ العسل والتین و نبیذ الحنطة والذرة والشعیر حلال وان لم یطبخ۔ وھذا عند ابی حنیفة وابی یوسف رحمھما اللہ اذا کان من غیر لھو وطرب لقولہ علیہ السلام الخمر من ھاتین الشجرتین و اشار الی الکرمة و النخلة خص التحریم بھا[2]

شہد، انجیر، گندم، باجرہ اور جو کی نبیذ حلال ہے چاہے وہ پکائی نہ گئی ہو اور یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا استعمال لہو ولعب کے لئے نہ ہو کیونکہ حضور صلعم کا فرمان ہے کہ "شراب" صرف ان دو درختوں سے بنتی ہے اور آپ نے انگور اور کھجور کی طرف اشارہ کیا اور حرمت کا حکم ان دونوں کے ساتھ مخصوص فرمایا۔

(۲) وھو نص علی ان ما یتخذ من الحنطة والشعیر والعسل والذرة حلال عند ابی حنیفة ولا تحد شاربہ عندہ وان سکر منہ[3]

اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو "چیز" گندم، جو، شہد اور باجرہ سے بنائی جائے گی وہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے اور اس کے پینے والے پر کوئی حد نہیں چاہے اسکے پینے سے اسے نشہ ہی کیوں نہ آ جائے۔

(۳) ولا باس بالخلیطین لما روی عن ابن زیاد انہ قال سقانی ابن عمر شربة

---

[1] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۴۸۔ [2] ہدایہ آخرین مصطفائی صفحہ ۴۷۱ کتاب الاشربۃ۔ یا شرح فتح القدیر مصری جلد ۸ صفحہ ۱۶۱۔

[3] ایضاً۔

ما كدت اهتدى الى اهلى ۔[1]

اور خلیطین (ایک قسم کی شراب جو کھجور اور انگور کے عرق کو ملا کر بنائی جاتی ہے) کے استعمال میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ ابن زیاد سے روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے مجھے ایسا مشروب پلایا کہ میں نشہ کی وجہ سے گھر کا راستہ نہ پا سکتا تھا۔

(۴) وعصير العنب اذا طبخ حتى ذهب ثلثاه و بقى ثلثه حلال و ان اشتد[2]

اور انگوروں کا رس اس طرح پکایا جائے کہ اس میں سے دو تہائی خشک ہو جائے اور باقی ایک تہائی رہ جائے تو وہ حلال ہے چاہے وہ نشہ والا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

(۵) و اذا تخللت الخمر وحلت سواء صارت خلا بنفسها او بشيء يطرح فيها ولا يكره تخليلها۔[3]

جب شراب کو سرکہ میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ حلال ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ خود بخود سرکہ بن جائے یا اس میں کوئی چیز ڈال دی جائے اور شراب سے سرکہ بنانے میں کوئی قباحت نہیں۔

اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم انہی اقوال پر اکتفا کرتے ہیں۔ علماء حضرات کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں اور ان میں ایسی درجنوں صورتیں دی ہوئی ہیں۔ اور شرابی پر حد جاری کرنے کے بارے میں تو اس سے بھی زیادہ تفصیلات ہیں یہاں تک کہ شرابی اگر شراب کی بو کے ختم ہو جانے کے بعد خود بھی شراب پینے کا اقرار کرے تو بھی اس پر حد نہیں ہوگی وغیرہ۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۵۰۰۔ یا شرح فتح القدیر جلد ۴۔ صفحہ ۱۷۹۔

کیا یہ حضرات فرمائیں گے کہ جب شراب کو حرام قرار دیئے جانے کا قانون مرتب کیا جائے گا تو اس میں شراب کی تعریف کیا دی جائے گی؟ واضح رہے کہ جب قانون از روئے شریعت مرتب ہوگا تو شراب کی تعریف بھی از روئے شریعت ہی متعین کی جائے گی۔ اس میں کسی کی ذاتی رائے یا کسی مروجہ تعریف کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

یہ تو تھی شراب کی حرمت جیسے سادہ مسئلہ کے بارے میں اختلاف کی تفصیل۔ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مسئلہ بھی اتنا آسان نہیں جتنا یہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ شرعی حدود کے دوسرے مسائل میں بھی اسی قسم کے اختلافات ہیں ــــ مثلاً شراب سے بھی بڑھ کر دوسری برائی زناکاری ہے۔ اس بارے میں

---

[1] ہدایہ آخرین مصطفائی ص ۴۸۲۔ کتاب الاشربۃ۔ یا شرح فتح القدیر مصری۔ جلد ۸۔ صفحہ ۱۶۱ ۔ [2] ایضاً۔

[3] ہدایہ اولین مجیدی۔ صفحہ ۴۸۳۔

اگر پوری تفصیلات نقل کی جائیں تو بحث لمبی ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ شیعہ حضرات جس مُتعہ کو جائز اور عین حلال قرار دیتے ہیں، کیا حنفی حضرات اسے حلال تسلیم کرنے کے لئے تیار ہونگے یا اُسے زنا قرار دینگے؟ حنفی فقہ اُسے حرام قرار دیتی ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ زنا کی سب سے قبیح صورت لواطت ہے۔ اس کے شرعی حکم کے بارے میں تفصیلات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو معاملہ کی سنگینی کا احساس ہو سکتا ہے۔

امام شافعی، اہلحدیث اور شیعہ حضرات کے نزدیک لواطت کے مرتکب ہونے پر شرعی حد نافذ ہوگی۔ ملاحظہ ہو تہذیب الاحکام جلد ۱۰ صفحہ ۵۲۔ بلکہ اہل تشیع کے نزدیک تو اس کی سزا زنا سے بھی زیادہ سخت ہے:

وعن جعفر بن محمد (ع) انّہٗ قال یرجم الّذی یوتی فی دبرہٖ الفاعل والمفعول۔[۱]

حضرت جعفر بن محمد سے روایت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ لواطت کرنے والے فاعل اور مفعول دونوں کو رجم (سنگسار) کیا جائے۔

اس کے برعکس حنفی فقہ میں یہ احکام ملتے ہیں۔

من اتی امراۃً فی الموضع المکروہ او عمل عمل قوم لوطٍ فلاحدّ علیہ عند ابی حنیفۃ۔[۲]

جس نے عورت سے یا مرد سے لواطت کی تو اس پر کوئی حد نہیں۔

فرمایئے! لواطت کے بارے میں شرعی قانون کے نفاذ کے وقت مختلف فرقوں کے احکام کے اس اختلاف کو کیسے نظر انداز کیا جائے گا؟

شرعی حدود میں اصولی اختلاف

یہ تو تھا شرعی حدود کا ایک آدھ مسئلہ۔ ہمارے ان مختلف مذاہب میں تو شرعی حدود کے وجوب تک میں اصولی اختلاف ہے۔

(۱) امام شافعی رح کے نزدیک جس شخص پر شرعی حد (یعنی سزا) نافذ ہونے والی ہو وہ اگر اس وقت توبہ کرلے تو اس پر سے شرعی حد ساقط ہو جائے گی۔ علامہ ابن رشد فرماتے ہیں۔

ومن ھنا تعلق الشافعی بان التوبۃ تسقط الحدود والجمھور علٰی خلافہم۔[۳]

اسی وجہ سے تو امام شافعی رح کا یہ مسلک ہے کہ توبہ کرنے سے شرعی حد ساقط ہو جاتی ہے جبکہ جمہور علماء کا مسلک اس کے خلاف ہے۔

---

[۱] دعائم الاسلام جلد دوم، صفحہ ۴۵۴۔ [۲] ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۴۹۱۔ (باب الوطی الذی یوجب الحد)

[۳] ہدایۃ المجتہد جلد ۲، صفحہ ۳۶۷۔

(۲) جمہور علماء سے مراد ائمہ اہل حدیث ہیں اور ان کا مسلک امام مالک کے اس فیصلہ کے مطابق ہے۔

انہ لا یقبل رجوعہ فی الزنا ولا فی السرقۃ ولا فی الشرب [۱]

زنا، چوری اور شراب کا اقرار کر کے کسی کا پھر جانا قابلِ قبول نہیں بلکہ اس پر شرعی حد نافذ ہوگی۔

(۳) احناف کا مسلک یہ ہے کہ کوئی شخص شرعی جرم کا اقرار کر کے پھر جائے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی۔

من اقر بشرب الخمر والمسکر ثم رجع لم یحد [۲]

اگر کوئی شخص شراب اور نشہ کا اقرار کرنے کے بعد اپنے اقرار سے پھر جائے تو اس پر کوئی حد نہیں۔

اس بارے میں حنفی فقہ میں بڑی تفصیلات موجود ہیں اور اہل علم اسی باب میں انہیں ملاحظہ فرما سکتے ہیں وہاں تو ایسی ایسی تفصیلات بھی موجود ہیں کہ جن کو نقل کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی خود مختار بادشاہ کوئی بُرا فعل کرے (مثلاً شراب خوری، چوری، زنا وغیرہ) تو اس پر کوئی حد نہیں۔ صرف قصاص وجرم قتل کا مواخذہ ہوگا۔ کل شیئٍ صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امامٌ فلا حدَّ علیہ الا القصاص۔ (ہدایہ اولین مجیدی۔ صفحہ ۴۹۳)

(۴) شیعہ حضرات نے اس بارے میں درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اقرار سے پھر جائے تو اسے جانے دو۔ لیکن اگر گواہی سے جرم ثابت ہو جائے تو پھر اس شخص پر حد نافذ ہوگی۔ ملاحظہ ہو تہذیب الاحکام۔ جلد ۱۰۔ صفحہ ۴۲۔

شرعی حدود کے علاوہ اہم مسائل

ان حضرات نے اپنے بیانات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی قانون کا نفاذ شرعی حدود کے نفاذ تک محدود ہے اُمت کے معاشی مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ معاشی نظام کے بارے میں ان کے اختلاف نے آجکل جو سنگین شکل اختیار کر رکھی ہے عوام اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ علماء کے ایک کثیر گروہ نے، جن کی نمائندہ جماعت، جمعیت العلماء اسلام ہے، اُس صدارتی امیدوار کی حمایت کا اعلان کر رکھا ہے [۳] جو ملک میں سوشلزم کا معاشی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طرف اس کی تشریح کرتے ہوئے یہاں تک سنا گیا ہے کہ یہ اسلامی مساوات کی طرف ایک قدم ہے۔ اس کے برعکس علماء کے ایک دوسرے گروہ نے جس کی نمائندہ جماعت جماعتِ اسلامی ہے، اس کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے سربراہ کے ۲۹ دسمبر

---

[۱] المیزان الکبریٰ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۷۷۔ [۲] ہدایہ اولین مجیدی۔ صفحہ ۵۰۲

[۳] روزنامہ تعمیر راولپنڈی۔ مورخہ یکم جنوری ۱۹۶۹ء۔ صفحہ اول۔ کالم ۷۔

کے خطاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک ہمارے سر ہماری گردنوں پر قائم ہیں، اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں کہ وہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو لائے۔ یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کا ملک ہے۔ یہ مارکس کی امت کا ملک نہیں ہے۔ یہ ماؤزے تنگ کی امت کا ملک نہیں ہے۔[1]

کسی مسئلہ میں اختلاف کی اس سے زیادہ سنگین مثال اور کونسی پیش کی جا سکتی ہے اور لطف یہ ہے کہ علماء کے ان دو بڑے گروہوں کا اس بارے میں یہ اختلاف کوئی نیا نہیں بلکہ مصر میں صدر ناصر کے اسطرف قدم بڑھانے کے بعد، ہمارے علماء کے قبل الذکر گروہ کے نزدیک وہ بطلِ اسلام شمار ہوتا ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک دشمنِ اسلام۔

(۰)

ہم سر دست، انہی تفاصیل پر اکتفا کرتے ہیں، اور قارئین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اختلافات کی موجودگی میں ان حضرات علماء کرام کا یہ ارشاد کہ فرقوں کی موجودگی، ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کے مرتب اور نافذ کرنے کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی، کہاں تک دیانت اور صداقت پر مبنی ہے؟ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم ابھی انہیں اقتدار کی کرسیوں پر بٹھا کر کہتے کہ لیجئے سرکار! اب ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین نافذ کر کے دکھایئے!

یاد رکھیئے۔ ایک اسلامی مملکت میں، متفق علیہ ضابطہ قوانین کے مرتب کئے جانے کی شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ مختلف فرقے اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر، قرآن کریم کو دین میں آخری حجت اور سند تسلیم کر لیں۔ اور اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، باہمی مشورہ سے، از سر نو فقہ کی تدوین کریں۔ اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو پھر ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین قیامت تک مرتب نہیں ہو سکتا۔ مشکلات کا حل نہ عوام کو دھوکا دینے سے مل سکتا ہے، نہ زور زور سے ڈگڈگی بجانے سے۔ ان کا حل حقائق کا سامنا کرنے ہی سے مل سکتا ہے۔ اور اسی سے یہ گریز کرتے اور فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

(بقیہ)

---

[1] ہفت روزہ ایشیا۔ لاہور۔ ۵ جنوری۔ صفحہ اول۔

ملک کا معاشی پروگرام

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا سارا مسئلہ "روٹی" نہیں، لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ روٹی کا مسئلہ، انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم معاشی مسئلہ کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک، رزق کی فراوانی اور مرفہ الحالی نعمائے خداوندی میں سے ہے اور بھوک خدا کا عذاب (۱۶/۱۱۲)۔ وہ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتتی ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کی بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ جس قوم کی یہاں کی زندگی اس طرح اندھوں کی سی ہو وہ آخرت میں بھی اندھی ہوگی۔ یعنی جس کی دنیا خراب ہوگی اُس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ (۲۰/۱۲۴) اس نے جنتی زندگی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات — روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ — سے محروم نہیں ہوگا۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اور ہر شخص کو جہاں سے جی چاہے، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے گا۔ (۲/۳۵) اتنا ہی نہیں کہ اس میں ہر فرد کو صرف بنیادی ضروریاتِ زندگی بافراغت میسر ہوں گی بلکہ اس میں تمام سامانِ آسائش و آرائش، (جس قدر بھی قوم کے پاس ہوگا) ہر فرد کو یکساں طور پر حاصل ہوگا — جنت میں کہیں معاشی لحاظ سے طبقاتی تفریق کا ذکر نہیں۔

اوپر جو کہا گیا ہے کہ، "جس کی دنیا میں معیشت تنگ ہوگی اس کی عقبےٰ بھی خراب ہوگی"، تو یہ ایک عظیم حقیقت کا اعلان ہے۔ تنگیٔ معیشت غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہے اور غلط معاشی نظام سے جس قدر اخلاقی عیوب پیدا ہوتے ہیں اس کی زندہ مثال خود ہمارا اپنا معاشرہ ہے۔ اس سے اوپر کے طبقے میں، افراطِ زر کے پیدا کردہ عیوب عام ہوتے ہیں اور نچلے طبقہ میں افلاس و محتاجی کے پیدا کردہ عیوب عام۔ یوں اس قوم کی عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے واضح الفاظ میں فرما دیا کہ الفقر سواد الوجہ فی الدارین۔ یاد رکھو۔ افلاس، دونوں جہانوں میں روسیاہی کا موجب ہوتا ہے — یہ روسیاہی، نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا ہر رسول، اس نظام کے خلاف پیغامِ انقلاب لے کر آتا رہا۔ نظامِ سرمایہ داری کے حاملین (مترفین) نے، مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملا کر ہمیشہ اس

پیغامِ انقلاب کی مخالفت کی۔ اُس وقت بھی یہی ہوا اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ اِس وقت پاکستانی معاشرہ جس جہنّم کے عذاب میں گرفتار ہے اس کی بنیادی وجہ نظامِ سرمایہ داری کا جنون ہے جو انسانوں کو مستقل اقدارِ خداوندی سے سرکش بنا دیتا ہے۔ عوام اب معاشی بدحالی کے ہاتھوں تنگ آکر بلبلا اٹھے ہیں اور ملک کا موجودہ انتشار اسی بلبلاہٹ کا محسوس مظاہرہ ہے۔

ملک کی مختلف سیاسی پارٹیاں' جو احزابِ اختلاف کے عنوان سے متعارف ہیں' عوام کی ہمدردی اور بہی خواہی کے دعاوی بلند کر کے' ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر سامنے آرہی ہیں اور ان سے یہ کہہ رہی ہیں کہ تم موجودہ حزبِ اقتدار کو برطرف کرنے میں ہمارا ساتھ دو۔ تمہارے تمام دلدر دور ہو جائینگے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' عوام کے اس دلدر کی بنیادی وجہ' ملک کا غیر قرآنی (سرمایہ دارانہ) معاشی نظام ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پارٹیاں' موجودہ حزبِ اقتدار کو برطرف کرنے کے بعد' ملک میں کس قسم کا معاشی نظام قائم کرنا چاہتی ہیں۔ یہ سوال بنیادی فلہذا بڑا اہم ہے۔ اس کا جواب ہم سے نہیں' بلکہ ان احزابِ مخالف کے سب سے بڑے وکیل کی زبان سے سنیئے۔ اس وقت' ان پارٹیوں کا سب سے بڑا (بلکہ یوں کہیئے کہ واحد) ترجمان' روزنامہ 'نوائے وقت' ہے۔ اس نے اپنی ۳ر جنوری کی اشاعت میں'

تحریکِ جمہوریت اور معاشی پروگرام

کے عنوان سے ایک مقالۂ افتتاحیہ سپردِ قلم کیا ہے جسے ہم من وعن درج ذیل کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر' اقتباس کی طوالت سے ہمیں معذور سمجھیں گے۔ اس افتتاحیہ کا مطالعہ غور سے فرمایئے۔

"موجودہ نظام و اربابِ حکومت کے خلاف ملک گیر (اور صحیح معنوں میں عوامی) مظاہروں کے بعد اپوزیشن کی صفوں میں اس وقت انتشار' باہمی بے اعتمادی اور کسی حد تک نفسی نفسی کی جو کیفیت نظر آرہی ہے اس کی بنیادی وجہ اپوزیشن پارٹیوں کی بہت زیادہ تعداد ہے۔ ان میں بیشتر تنظیمی اعتبار سے اس قدر کمزور ہیں کہ اگر انہیں سیاسی گروہ قرار دیا جائے تو اس میں بہت زیادہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت جو انتشار بڑھ رہا ہے' اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا کہ اپوزیشن بالعموم اور تحریکِ جمہوریت بالخصوص کس قسم کے معاشی پروگرام کی علمبردار ہے؛ اس معاملہ میں بعض اپوزیشن جماعتوں میں جو تصادم ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں اور اس تصادم کی وجہ سے انتہا پسندی کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے' وہ بھی محتاجِ وضاحت نہیں۔ پھر اس تصادم اور اس کے نتیجہ میں انتہا پسندی سے جمہوری تحریک کو بالعموم اور تحریکِ جمہوریت کو بالخصوص جو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اس کی نشاندہی کے لئے علمِ نجوم میں ماہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

معاشی پروگرام کے بارے میں اپوزیشن میں بڑھتے ہوئے فکری انتشار کی سب سے زیادہ ذمہ داری تحریکِ جمہوریت پر عاید ہوتی ہے جس کے لیڈروں اور رہنماؤں نے باہمی افہام وتفہیم سے آئینی وسیاسی مسائل کے بارے میں تو ـــ سب کے لئے قابلِ قبول ـــ آٹھ نکات پر مشتمل پروگرام مرتب کر لیا ہے لیکن جن معاشرتی ناہمواریوں اور معاشی استحصال کی قباحتوں کی وجہ سے عام لوگوں کو ناقابلِ بیان پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کے ازالہ اور اصلاح کے لئے اپنے سیاسی وآئینی نظام کی طرح (اور مطابق) معاشرتی ومعاشی انصاف کا کوئی پروگرام مرتب کرنے سے مسلسل احتراز بلکہ انکار وانحراف کیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے۔ تحریکِ جمہوریت کے رہنماؤں اور لیڈروں کی طرف سے صرف یہ جواب دینا کافی سمجھا جاتا ہے کہ

جب تک جمہوریت بحال نہ ہو، بہترین معاشرتی ومعاشی پروگرام بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اولین اور اہم ترین مسئلہ جمہوریت کی بحالی ہے۔ جب جمہوریت بحال ہو جائے گی تو پھر ہر پارٹی اپنے معاشرتی ومعاشی پروگرام پر عملدرآمد کر سکے گی۔ جمہوریت کی بحالی سے پہلے معاشرتی ومعاشی اصلاح وانصاف کا سوال اٹھانا گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے مترادف ہے۔

منطقی اعتبار سے یہ اندازِ بیان خواہ کس قدر درست قرار دیا جائے، عملی اعتبار سے ان خطوط پر فکر واظہار منفی، غلط اور کوتاہ اندیشانہ بلکہ خود غرضانہ ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اس گزارش پر تحریکِ جمہوریت کے رہنما بہت برہم اور کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ایک سچی اور بنیادی بات ہے کہ اسے صرف وہی شخص نظر انداز کر سکتا ہے جو حق بینی حق اندیشی اور حق گوئی سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مزید تعجب اور دکھ اس بات پر ہوتا ہے کہ اپوزیشن جماعتوں کی طرف سے بالعموم اور تحریکِ جمہوریت کے لیڈروں کی طرف سے بالخصوص ملک کے موجودہ معاشی حالات اور استحصال عام لوگوں کے افلاس اور محرومیوں پر تو دن رات تبصرہ کیا جاتا ہے لیکن وہ اصلاحِ احوال کے سلسلے میں کوئی دو ٹوک بات کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس معاملہ میں وہ یہ بنیادی بات بھی نظر انداز کر جاتے ہیں کہ تحریکِ جمہوریت کے آٹھ نکاتی پروگرام میں معاشی ومعاشرتی مسائل کا برملا ذکر موجود ہے۔ وہ عام لوگوں کی معاشی بدحالی پر خون کے آنسو بھی روتے ہیں۔ ان کی دردمندانہ باتوں سے یہ بھی احساس ہے کہ وہ عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے پرخلوص عزم سے بھی سرشار ہیں لیکن جب کبھی ٹھوس معاشی پروگرام کا سوال پیدا ہوتا ہے، تو ان کے نزدیک بحالیٔ جمہوریت سے پہلے اس کا ذکر اور مطالبہ بے معنی اور فضول قرار دیا جاتا ہے۔

اس اندازِ فکر کی نمایاں مثال اس تقریر میں بھی ملتی ہے جو چند روز قبل تحریکِ جمہوریت کے ایک سرکردہ رہنما سردار شوکت حیات نے ننکانہ صاحب میں کی ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق سردار صاحب نے یہ کہا ہے۔ "معاشی پروگرام کے تعین سے پہلے جمہوریت کی بحالی ضروری ہے کیونکہ معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ایک خاص

ماحول اور آزادانہ فضا کی ضرورت ہے لیکن جمہوریت کی بحالی سے پہلے یہ فضا میسر نہیں ہو سکتی"۔ سردار صاحب سے اس موقع پر یہ زبان زدِ خاص و عام سوال بھی پوچھا گیا کہ ــــ "کیا جمہوریت کوئی جادو کی چھڑی ہے، کہ اس کے بحال ہوتے ہی ملک کے تمام مسائل حل ہو جائیں اور سرمایہ داروں کے اثر و رسوخ اور اہل صنعت و تجارت کی لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آخر ملک کے غریب عوام کی اقتصادی حالت سدھارنے اور انہیں معاشرتی انصاف مہیا کرنے کے لئے تحریک جمہوریت کسی معاشی پروگرام پر کیوں متفق نہیں ہو سکتی"۔ اخباری اطلاع کے مطابق سردار صاحب نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا لب لباب یہ ہے:۔

"کوئی معاشی پروگرام خواہ کتنا جاندار ہو جب تک اسکے پنپنے اور اس پر عمل درآمد کے لئے حالات سازگار نہ ہوں، وہ بے کار ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے تحریک جمہوریت کی اوّلین کوشش یہی ہے کہ پہلے ۱۹۵۶ء کا جمہوری آئین بحال کرایا جائے اور ملک میں آزادانہ ماحول اور جمہوری فضا پیدا کی جائے۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں سب کچھ موجود ہے، اس میں جمہوریت اور اسلام کے معاشرتی و معاشی انصاف کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ چنانچہ جب جمہوریت بحال ہوگی، تمام سیاسی جماعتیں عوام کے سامنے اپنا اپنا معاشی و معاشرتی منشور پیش کریں گی اور عوام جس منشور کو پسند کریں گے، اور آزادانہ انتخابات میں جس کے حق میں فیصلہ دینگے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ عوام کس قسم کے معاشی پروگرام کے حامی ہیں"۔

سردار صاحب کے جواب کی پوری تفصیل دہرانے سے ہمارا مطلب یہ واضح کرنا ہے کہ تحریک جمہوریت کے لیڈر کس منفی اندازِ فکر کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں؟ ایک طرف وہ سب سے زیادہ زور موجودہ نظامِ حکومت میں عوام کی معاشی بدحالی اور بے چارگی پر دیتے ہیں لیکن جس طرح موجودہ آئین و نظامِ حکومت کا (اپنی دانست میں) بہتر بدل تجویز کرتے ہیں اسی طرح معاشی بدحالی کے ازالہ کی صورت تجویز نہیں کرتے اور اس منطقی تضاد اور فکری الجھاؤ کا بھی احساس نہیں کرتے کہ جب وہ ایک ہی سانس میں آئین و نظامِ حکومت میں تبدیلی کے لئے لوگوں کو متحد ہونے کی تلقین کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ مژدہ سناتے ہیں کہ جمہوریت بحال ہونے کے بعد ہر سیاسی پارٹی اپنا اپنا معاشی پروگرام عوام کے سامنے پیش کرے گی۔ تو عام لوگوں پر اس کا یہ اثر بھی پڑ سکتا ہے کہ یہ اصحاب آپس میں لڑنے کی آزادی کے لئے بحالیٔ جمہوریت چاہتے ہیں۔ اس فکری افلاس کی کوکھ سے وہ انتشار جنم لے رہا ہے جس کا ایک محاذ اسلام اور سوشلزم کے علمبرداروں کی کھلی اور بڑھتی ہوئی لڑائی ہے۔ حالانکہ اس الجھاؤ کا سیدھا سادہ حل یہ ہے کہ جس طرح آئینی و سیاسی مسائل کے بارے میں تحریک جمہوریت والوں نے آٹھ نکات پر مبنی سب کے لئے قابلِ قبول پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس طرح تحریک میں شامل ہر جماعت کے معاشی پروگرام کے مشترک نکات پر مبنی ایک ایسا معاشی پروگرام

بھی مرتب کیا جا سکتا ہے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اور اس پروگرام میں نکتہ اول — پچھلے دس سال
میں ناجائز دولت کا بے لاگ اور بے رو رعایت محاسبہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ لوگوں کے
عام اور مسلسل مطالبہ کے باوجود تحریکِ جمہوریت کے آزمودہ کار لیڈروں [illegible] دانشمند بزرگوں کو اس بنیادی ضرورت
— اور اس کے سادہ اور قابلِ عمل حل کا اب تک احساس کیوں نہیں ہو سکا۔ چنانچہ بعض اوقات یہ محسوس ہونے
لگتا ہے کہ ان لیڈروں اور بزرگوں کو سمجھانے کے لئے لوگوں کو کسی اور "زبان" کی ضرورت ہے۔ یا پھر ان لیڈروں
اور بزرگوں کے لئے "اور دل" ملنے کی دعا کرنی چاہیئے۔ پہلے جمہوریت اور پھر معاشی پروگرام پر اصرار اگر کج فہمی نہیں تو
بصیرت و فراست کا فقدان ضرور ہے۔ اس دور میں سیاسی و معاشی مسائل لازم و ملزوم حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور
جو اصحاب سلطانئ جمہور کے اس زمانہ میں سیاسی آزادی کے ساتھ عوام سے معاشی انصاف کی ضرورت محسوس نہیں
کرتے، اگر ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی جگہ عوام کی رہنمائی و ترجمانی کا منصب نہیں بلکہ عجائب گھر کی الماری یا
ریٹائرمنٹ میں گوشہ نشینی ہے۔ تو الفاظ سخت ہونے کے باوجود یہ بات بالکل درست اور مبنی بر صداقت ہے۔ "ستم ظر
یہ ہے ان مسیحائے قوم کی حالت جو ملت کے درد سے مضطرب و بیقرار خون کے آنسو بہاتے ایک متحدہ محاذ
کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ خود مترفین (سرمایہ داروں) اور مذہبی اجارہ داروں پر مشتمل
ہے، اور ان سے یہ توقع کرنا کہ یہ نظامِ سرمایہ داری کو الٹ کر مساواتِ انسانیہ کا قرآنی نظام متشکل کر دیں گے —
قارون اور ہامان سے ضربِ کلیمی کی امید رکھنا ہے۔

احزابِ مخالف میں دو گروہ بے شک ایسے ہیں جو معاشی پروگرام کو اہمیت دیتے ہیں (یہ تحریکِ جمہوریت کے
متحدہ محاذ میں شامل نہیں)۔ ان میں سے ایک روسی نظامِ معیشت کا حامی ہے اور دوسرا گروہ مسٹر بھٹو کی
پیپلز پارٹی ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ چینی نظام کی مؤید ہے۔ معاشی نظام روس کا ہو یا چین کا اس
میں بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کو محض طبیعاتی زندگی (PHYSICAL LIFE) قرار دیتا
ہے اس لئے اس کے نزدیک انسانی زندگی کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے اور بس۔ وہ نہ مستقل اقدارِ خداوندی کا قائل
ہے نہ حیاتِ آخرت کو تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا جس معاشی نظام کی بنیاد اس قسم کے نظریۂ زندگی پر ہو وہ نظام ایک
مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اور جب وہ ایک مسلمان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تو ایک
ایسی مملکت کا نظام کیسے بن سکتا ہے جس کا مقصود اسلامی مملکت بننا ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نہایت سادگی و
پرکاری سے کرتی یہ ہے کہ وہ روس یا چین کے اس نظریۂ حیات کو ابھار کر سامنے لاتی اور مسلمانوں سے
پوچھتی ہے کہ بتاؤ! کیا یہ چیز کبھی اسلامی ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان بھی اس کا جواب اثبات (ہاں) میں
نہیں دے سکتا۔ اس طرح، وہ اس غیر اسلامی نظریہ کی آڑ لے کر اس نظامِ سرمایہ داری کے استحکام کے ممد و

مؤید ہوجاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ یہ حربہ درحقیقت' نظامِ سرمایہ داری کے مغربی شاطروں کا وضع کردہ تھا جنہوں نے یہ سلوگن عام کیا تھا کہ ــــ خدا پرستو! سوشلزم کے ملحدانہ نظام کی مخالفت کے لئے اکٹھے ہوجاؤ"۔ ہماری مذہبی پیشوائیت اسی طوطیٔ پسِ آئینہ' کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم کہا کرتے ہیں کہ ہمیں سوشلزم یا اسلامی سوشلزم قسم کی اصطلاحات استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ آپ قرآن کا نظامِ ربوبیت کہئے اور پھر دیکھئے کہ انہیں کس طرح اسے خدا فراموش ملحدانہ نظام کہنے کی جرأت ہوتی ہے؟

مسٹر بھٹو کی طرف سے پیش کردہ "تثلیث" ان کی' دین کی حیثیت سے بے خبری کی غماز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ہمارا مذہب اسلام ہے۔
ہماری معیشت سوشلزم ہے۔
ہماری سیاست جمہوریت ہے۔

ہم ان کی اس تثلیث پر اس سے پہلے بھی ان صفحات میں تنقید کرچکے ہیں۔ ان کے ذہن میں اسلام کا تصوّر وہی ہے جو مغرب میں مذہب (RELIGION) سے متبادر ہوتا ہے۔ یعنی مذہب محض پوجا پاٹ یا چند رسوم ومناسک کے مجموعہ کا نام ہے جن کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے۔ اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل کا دائرہ اس سے الگ ہے۔ مذہب اور سیاست کی اس ثنویت کو' سیکولرازم کہا جاتا ہے' اس لئے یہ تصوّر ایک اسلامی مملکت میں کبھی بار نہیں پا سکتا۔ اسلام ایک دین ہے اور دین ایک ایسے اجتماعی نظامِ انسانیہ کا نام ہے جس میں افراد کی ذات کی نشو ونما اس انداز سے ہوتی جاتی ہے کہ ان کی یہ دنیا بھی سنور جاتی ہے' اور آخرت بھی حسین ہوجاتی ہے۔ جہاں تک روٹی کے مسئلہ کا سوال ہے' دین کے اجتماعی نظام میں۔

(۱) ہر فردِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔

(۲) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار' انفرادی ملکیت کے بجائے اُمّت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔

(۳) ان ذرائع پیداوار کے بہترین نظم ونسق سے جب معاشرہ کا معیارِ زیست بلند ہو تو اس بلندی میں مملکت کا ہر فرد یکساں طور پر شریک ہو۔ وہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری میں نہ آجائے۔

لیکن تنہا اس معاشی نظام کے نفاذ سے مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ اس کا سارا کاروبار خدا کے عطا کردہ' قوانین واصول کے مطابق سرانجام پانا چاہیئے جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اور جو ہمیشہ کے لئے غیرمتبدل

رہیں گے۔

جو جماعت اس نظام کی علمبردار بن کر اُٹھے گی، وہی ملک و ملت کی صحیح بہی خواہ ہوگی اور اسی کے پروگرام کو اسلامی کہلانے کا حق پہنچے گا۔ اس کے سوا جو پروگرام بھی ہے وہ مفاد پرستی اور ہوسِ اقتدار کا پیدا کردہ ہے خواہ وہ کسی کی طرف سے پیش کیا جائے۔ اور جب انتخاب دو باطلوں ہی میں ہو تو پھر خدا کا نام درمیان میں کیوں لایا جائے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے، مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی جنوری ۱۹۶۹ء کی اشاعت آئی۔ اس کے افتتاحیہ (اشارات) میں معاشی مسئلہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعت اسلامی سوشلزم کی کس حد تک مخالف ہے۔ اس پرچہ میں، سوشلزم کے ساتھ، نظام سرمایہ داری کی بھی سخت مخالفت کی گئی ہے۔ تحریر ہے۔ " قومی قیادت پر اس وقت جو ایک اور ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ معیشت کے موجودہ نظام میں سیاسی تبدیلی ہے۔ اس وقت ملک میں جو نظام رائج ہے وہ سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم ہے۔ جس کا خاصہ یہ ہے کہ سرمایہ کو معاشی ڈھانچہ کی اصل قرار دے کر محنت کشوں کی قدر متعین کی جائے۔ یہ پورا نظام لوٹ کھسوٹ پر قائم ہوتا ہے اور اس میں سرمایہ دار طبقوں کو استحصال کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔" اس کے بعد تحریر ہے — " اس وقت اس ملک میں چونکہ سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہے اس لئے اس کی ساری لعنتیں ہمارے معاشرہ پر پوری طرح مسلط ہیں۔ ملکی دولت کا اسی فیصد حصہ صرف بیس خاندانوں کی تحویل میں ہے اور وہ اپنی اس دولت کے بل بوتے پر محنت کشوں کا خون نہایت بُری طرح سے چوس رہے ہیں۔" نظام سرمایہ داری کو اس طرح ملعون قرار دینے کے بعد، سوشلزم کے نظام کو بھی لعنت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا معاشی نظام کے سلسلہ میں کوئی تیسری صورت ممکن نہیں؟ سوال بڑا اہم ہے۔ اب اسکا جواب سنیئے۔ لکھا ہے۔

> اسلام نے نوعِ انسانی کو جو اقدارِ حیات دی ہیں انہوں نے معاشی دائرے میں یہ عظیم انقلابی تصور پیش کیا ہے کہ معیشت میں اصل اہمیت سرمایہ کو نہیں بلکہ ذی روح انسان کو حاصل ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی جا سکتی ہے جو ہر قسم کے استحصال اور جور و استبداد سے پاک ہو۔ یہ اگرچہ ایک مشکل کام ہے، لیکن اگر اس تصور کی اساس پر ایک صحیح لائحہ عمل تیار کر لیا جائے تو یہ نہ صرف اہل پاکستان کے دکھوں کا علاج ہوگا بلکہ سرمایہ داری کے روح فرسا مظالم اور اشتراکیت کے دردناک عذاب سے نوعِ انسانی کو نجات دلا سکے گا۔ خدا کرے

کہ ہماری قیادت خلوص نیت کے ساتھ اس عظیم کام کی طرف بھی متوجہ ہو۔

آپ نے غور فرمالیا کہ نظام سرمایہ داری اور سوشلزم کو مردود قرار دے کر تیسری صورت کونسی تجویز کی گئی ہے؟ وہی دیرینہ حربہ کہ تیسری شکل اسلامی نظام ہے لیکن ہم یہ نہیں بتائینگے کہ وہ نظام ہے کیا۔۔ لیکن یہ بتائیں یا نہ بتائیں۔ ہم بتلاتے ہیں کہ وہ نظام کیا ہے۔ اسے مودودی صاحب نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں واضح کر رکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیّت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلاحد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ (ص ۵۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> اس کے بعد جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنی زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو ...... اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے...... اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ص ۵۳)

آپ غور فرمایئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اگر یہ ٹھیٹھ نظام سرمایہ داری نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ یہ لوگ کس طرح عوام کو کھلے بندوں دھوکا دیتے ہیں —— یہ نظام سرمایہ داری کی مخالفت کر کے عوام کو اپنا ہمنوا بنائیں گے اور اس کے بعد وہی نظام سرمایہ داری ان کے سر پر مسلط کر دینگے لیکن اس کا نام اسلامی نظام معیشت رکھیں گے!

کیا اس کے بعد سوشلزم کے حامی یہ نہیں پوچھینگے کہ

مجھ کو تو سکھادی ہے "افرنگ" نے زندیقی
اس عہد کے ملّا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

—— (باقی) ——

خورشید عالم

استعمار کا عالمی کردار (۱)

ان صفحات پر مختلف عنوانات کے تحت ان خار ہائے مغیلاں کی داستانِ خونچکاں جزءً اجزءً بیان ہوتی آئی ہے جو اقوامِ مغرب نے کشتِ انسانیت میں بوئے ۔۔۔ اور بوتی چلی آرہی ہیں۔ آج ان اجزائے پریشاں کو یکجا کرکے ان سے مرتب ہونے والی تصویر کا جائزہ لیتے ہیں۔ یورپ کے عہد کو تہذیب و ترقی کا عہد کہا، کہلوایا، مانا اور منوایا جاتا رہا ہے۔ اس کے چہرے کی چمک دمک سے ایک عرصہ تک یہ گمان بھی نہ گزرا کہ اس کا اندرون چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ یہ راز آہستہ آہستہ کھلا ۔۔۔ مشیت کے بے رحم ہاتھوں نے بالآخر کھول کے رکھ دیا ۔۔۔ کہ یہ ظلمات چشمۂ حیواں کا امین نہیں بلکہ، بقول اقبالؒ اس کے اندر ۔۔۔ آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب! یورپ جس زہر کا حامل تھا ۔۔۔ اور ہے ۔۔۔ اور جسے اس نے چار دانگِ عالم میں پھیلوایا، اور بر و بحر و فضا و خلاء میں دیوانہ وار پھیلائے چلا جا رہا ہے اس کا نام ہے استعمار۔ خدا جانے کہ اس داستانِ خونیں کو سنانے کیلئے کس کس کا لہو پانی ہوگا۔ کون کونسے خامے خونچکاں ہونگے، کیسی کیسی انگلیاں فگار ہونگی۔ یہ ہوگا۔ ہوتا چلا جائیگا۔ تا آنکہ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اُٹھے گی اور ظلم کا تختہ یوں الٹ جائیگا کہ انسان اور انسان کے مابین عداوت کا نہیں ائتلاف کا رشتہ استوار ہوگا۔ پھر نہ ظالم رہے گا نہ مظلوم۔ یہ تخیل کی خلاقی نہیں بدلتے اور بدلے مزاجِ روزگار کا حتمی تقاضا ہے۔ یورپ کا تختۂ مشق انسان اپنی پُرعزم اور بارآور جد و جہد سے اس مرحلے میں داخل ہوگیا ہے جہاں وہ حتم و یقین سے کہہ سکتا ہے کہ ۔۔۔ زمین و آسمان بے فائدہ گردش نہیں کرتے: یہ مشیت کے وہ دو پاٹ ہیں جو استعمار کی ہڈیوں تک کو پیسے جا رہے ہیں ۔۔۔ اور بالآخر پیس کے رکھ دینگے!

یورپ صنعتی انقلاب سے دوچار ہوا تو مشینوں کے زور پر وہ غیر یورپی دنیا پر مسلط ہوگیا۔ اس سے ظلم و استحصال کا دائرہ مقامی سے عالمگیر ہوگیا۔ پہلے چند جاگیر دار اپنی قوم کا خون چوستے تھے۔ ان کی مثال ان بھوکے شیروں کی سی تھی جو سزا کے طور پر ناخواندہ افراد پر بند اکھاڑے میں چھوڑ دیئے جایا کرتے تھے۔ صنعتی دور شروع ہوا تو ساری دنیا یورپ کے بھوکے شیروں کے لئے ناخواندہ افراد کا اکھاڑہ بن گئی۔ انہوں نے مقبوضہ ممالک کو بے دریغ لوٹا اور

مغلوب اقوام کو بے مزد غلام بنایا ان کی ضرورت دوہری تھی۔ ایک یہ کہ محروسہ علاقے ان کی مشینوں کا تنور شکم بھرنے کے لئے زرخیز کھیت بنے رہیں۔ دوسری یہ کہ ان علاقوں میں ان کی مصنوعات کی بلامقابلہ کھپت ہوتی رہے۔ اس کے لئے انہوں نے پوری کوشش کی کہ کہیں صنعت موجود ہے تو اسے برباد کر دیا جائے اور یہ انتظام کیا جائے کہ صنعت کہیں بھی اُبھرنے نہ پائے۔ ایسا بڑی دیدہ دلیری اور ظالمانہ انداز سے کیا گیا لیکن بایں انداز کہ مظلوم اقوام اول تو اسے ظلم نہ سمجھیں اور اگر ایسا سمجھنے پر آجائیں تو اسے اپنے اعمالِ بد کی جائز سزا سمجھیں، اور اس سزا سے بچنے کے لئے اس عطار کے لونڈے سے رجوع کریں جس کے سبب وہ گرفتارِ بلا ہوئے۔

اپنی اور انگریز کی مثال سامنے رکھ کر استعمار کا مطالعہ زیادہ واضح طور پر کیا جا سکے گا۔ انگریز برصغیر میں آنے لگے تو حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ سمندر کے راستے آنے کی وجہ سے انگریز بعض ساحلی علاقوں میں اپنے مراکز تجارت قائم کرتے گئے۔ تجارت نے آہستہ آہستہ ان کی حکومت کا راستہ ہموار کیا اور انگریز مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال میں عملاً حکمران بن گئے۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان یا جاگیردار تھے یا پارچہ باف۔ مشرقی پاکستان کا کپڑا دور دور تک جاتا تھا اور اپنی فقید المثال نفاست کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ یہ ہنرمندی اور مقبولیت انگریز کے استعماری مفاد کے منافی تھی جس ڈھٹائی اور سنگدلی سے اس صنعت کا انگریز نے استیصال کیا وہ ایک دلدوز کہانی ہے۔ اور عام طور پر معلوم بھی۔ اس صنعت کو تباہ کر کے معیشت کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا اور اسے برطانوی معیشت سے وابستہ کر کے بالکل اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان جاگیرداروں کو ایسا بے دست و پا بنا دیا گیا کہ ہندو اہلکار دیکھتے دیکھتے ان کی جاگیروں پر قابض ہو گئے۔ مسلمانوں کو مزید محتاج بنانے کے لئے ان پر زندگی کی راہیں مسدود کر دی گئیں۔ ان کی درس گاہیں دم توڑنے لگیں کیونکہ ان کے سرپرست قلاش بنا دیئے گئے تھے۔ یہ درس گاہیں بیکار بھی ہو گئیں کیونکہ رائج الوقت عربی اور فارسی زبانوں کو ختم کر کے انگریزی کو مسلط کر دیا گیا۔

سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے مسلمان کو تباہ کر کے انگریز نے ہندو کو بطور خاص نوازا اور اسے اپنا سیاسی حلقہ بگوش اور کاروباری گماشتہ بناتا چلا گیا۔ انگریز کی آمد تک ہندو، مذہب اور وطن کے اعتبار سے ایک نہیں تھا۔ اس کا کوئی تشخص نہیں تھا۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد برصغیر کے باشندوں کو ایک منفی قدر مشترک مل گئی تھی یعنی یہ کہ وہ غیر مسلم تھے۔ "ہندو" دراصل (دریائے) سندھ کی بدلی ہوئی ایرانی شکل ہے اور اس سے مراد وہ لوگ لئے جاتے تھے جو وادیٔ سندھ یعنی ہند میں رہتے تھے۔ یہ ہند آج کا مغربی پاکستان تھا۔ آج کے ہندوؤں میں قومیت اور وطنیت کا تصور انگریز کی وجہ سے پیدا ہوا۔ انگریز نے غیر مسلم محکومین کو اپنا ممنون اور آلۂ کار بنانے کے لئے جاگیریں اور مناصب دینا شروع کئے۔ مسلمانوں کے عہد میں غیر مسلم کسی طور محروم توجہ نہیں تھے۔ درباروں میں ان کی رسائی تھی۔

اور مقاماتِ بلند پر وہ فائز رہتے تھے۔ جاگیروں، انعامات اور مراعاتِ شاہانہ کے وہ بلا امتیاز مستحق رہتے تھے۔ باہر سے آنے کے باوجود مسلمان ان کے لئے غیر نہیں رہے۔ تھے کیونکہ وہ یہیں مقیم ہو گئے تھے اور حکومت ضرور کرتے تھے مگر برصغیر کو لوٹ کر کسی اور ملک میں اپنے گھر نہیں بھر رہے تھے۔ انگریز پہلے حکمران تھے جو باہر سے آتے اور غیر ملکیوں کی طرح حکومت کی۔ انہوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی اور یہ امکان ختم کرنے کے۔ لئے کہ کہیں مسلمان پھر سے اُبھر کر ان کی حاکمیت کے لئے خطرہ نہ بن جائیں انہوں نے سیاسی طور پر مسلمانوں کو اپنا مغلوب بنایا اور معاشی طور پر انہیں ہندوؤں کے تابع کر دیا۔ اس طرح ہندوؤں میں سیاسییتین جاگیر داروں، اور پہلے تاجروں اور بعد میں صنعت کاروں کے ایسے طبقات پیدا ہو گئے جو غیر ملکی حکمرانوں کے مرہونِ منت ہونے کی بنا پر ان کے آلہ کار رہتے۔

ان مہروں کی مدد سے انگریز نے سیاست کا شاطرانہ کھیل کھیلا۔ مسلمانوں کو تباہ حال بنا کے انگریز نے انہیں معاشرتی طور پر بھی خاک بوس بنایا۔ اور یہ انتظام کیا کہ اگر وہ کبھی اُبھرے تو ہندو اسکا راستہ روکے کھڑا ہو اور وہ اس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے۔ تنہا اور بے چارہ ہو جانے کے باوجود مسلمان ۱۸۵۷ء تک بلکہ اس سے کچھ آگے تک فرنگی غاصبوں کے خلاف برسرِ پیکار رہا مسلمان اپنی تاریخ کا شدید شعور رکھتا تھا اور اپنی روایاتِ جہاد و حریت کو ختم کر دینے کا روادار نہیں تھا۔ اس شعور اور اس جذبے کو دبانے کے لئے دسیسہ کار فرنگی علم و فضل کے لبادے پہن کر آتے اور مسلمانوں کی تاریخ کی نئی تعبیر کرنے لگے۔ یہ کام عیسائی مبلغین نے حکومت کی شہ پر اور اس کی پشت پناہی میں کیا۔ قرآن، رسول اکرمؐ اور شاہانِ اسلام پر رکیک حملے کئے جانے لگے۔ اور مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں میں تعصب پھیلایا جانے لگا۔ انگریزی زبان رائج ہوئی تو نصاب میں ایسی باتیں ازبر کرائی جانے لگیں جن سے یورپ کی برتری اور مسلمانوں کی کمتری ثابت ہوتی۔ یوں نئی پود کو یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ ان کے آباؤ اجداد غیر مہذب تھے اور ان کے کارنامے ایسے نہیں جن پر فخر کیا جا سکے۔ فخر کے قابل کارنامے اہلِ یورپ کے ہیں جو اہلِ مشرق اور اہلِ اسلام سے ہر لحاظ سے برتر اور ترقی یافتہ ہیں۔ یورپ مسلمانوں کا خوشہ چین نہیں ہے۔ مسلمان یورپ میں تہذیب و تمدن کی روشنی نہ پھیلاتے تو یورپ بربریت کی ظلمت میں سرگرداں رہتا لیکن جن مسلمانوں سے یورپ نے تہذیب کی روشنی حاصل کی ان کے دور کو اس نے قرونِ وسطےٰ اور قرونِ مظلمہ کا نام دیا اور تاریخ کو مسخ کر کے مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیا کہ تہذیب کی روشنی یورپ سے پھوٹی اور یورپ ہی کے دم سے پھیلی۔ یوں ان مسلمانوں کے تشخص اور شعورِ ذات کی بنیادیں کھوکھلی گئیں اور یورپ اور برطانیہ کی عظمت ان کے دلوں میں بسائی گئی۔ نئی پود کو اپنی روایات سے برگشتہ کرنے کے لئے تلبیس سے خوب خوب کام لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی برکاتِ انگلیشیہ کو داخل نصاب کر کے ازبر کرایا گیا۔ بے دریغ ظلم و تشدد سے اپنا تسلط جما لینے کے بعد انگریزی امن و انصاف کے گیت گائے، رٹائے اور دہرائے جانے لگے۔ کہا اور کہلوایا جانے لگا کہ شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے لگے ہیں۔ آزادی اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ ۔۔۔ اذانیں

دھڑتے سے دو مسجد دں ہیں! اس "مائی باپ" انگریز حکمران کی اطاعت کو مذہبی فریضہ سمجھا اور سمجھایا گیا۔ مولوی اور پیر تلاش کیے گئے۔ انہیں فضیلت کی دستاریں پہنائی گئیں۔ ان کے علم اور ان کی بزرگی کے ڈھنڈورے پیٹ پیٹ کر ان سے فتوے حاصل کیے گئے کہ انگریز "اولی الامر" کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت فرض سمجھی جانی چاہیئے۔ بال کی کھال اتار اتار کر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہر چند مسلمانوں کی حکومت ختم ہو جانے کی وجہ سے برصغیر "دارالسلام" نہیں رہا، اسے "دارالحرب" بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آخر انگریز نے امن و امان قائم کیا اور اس نے سجدے کی اجازت دے رکھی ہے۔ لہٰذا برصغیر کو "دارالامان" کہا جا سکتا ہے اور جب امن کا دور دورہ ہو تو پھر جنگ و جدال یعنی چہ! لہٰذا ــــ اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال!! دین کے لئے جنگ اور جدال کو تو حرام کہلوایا گیا لیکن دنیا سے اسلام کے کونوں کھدروں سے کرایہ دار تلاش کر کر کے اور فتوے حاصل کر کر کے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا کہ افغانستان اور ترکیہ کے خلاف لڑنا بادشاہِ وقت کی اطاعت کے مترادف ہے اور یہ از روئے مذہب جائز ہے۔

ایک طرف یہ مذہبی حیلے تلاش کئے گئے اور دوسری طرف ایسی اضافی نسبتوں کو ابھارا گیا جو ابھر کر انگریز کے کام تو آسکیں لیکن اس سے بلند تر مقصد تک کسی طور نہ پہنچ پائیں۔ فوج مخلوط بنائی گئی اور اس کی ترکیب ایسی رکھی گئی کہ ایک جز دوسرے جز کے حوالے سے آمادۂ پیکار کیا جا سکے۔ سکھوں کو دوسروں کے سامنے غیرت دلائی گئی اور انہیں یوں پچکارا گیا کہ سکھ بہادر لوگ ہیں۔ مسلمانوں کو بہ حیثیت مسلمان ابھارنے اور خطاب کرنے کی کوشش کم سے کم کی گئی۔ اطاعت کا فتوے سنانے اور منوانے کے علاوہ شاید ہی اُسے بہ حیثیت مسلمان خطاب کیا گیا ہو۔ اسے ضلعوں، خاندانوں، گھرانوں، ذاتوں میں تقسیم کیا گیا اور ان نسبتوں پر غیر معمولی زور دیا گیا۔ ذات کی ضرورت قانونی تقاضا بنا دی گئی۔ یہ جہلم کا ضلع وہ راولپنڈی کا۔ دونوں بہادر اور پیدائشی سپاہی۔ وہ گکھڑ یہ راجپوت۔ دونوں شمشیر زن۔ یہ زید کا پسر وہ بکر کی اولاد۔ دونوں جنگجو۔ ان کو علیحدہ علیحدہ ابھارا گیا اور ابھار ابھار کے ایک دوسرے سے مقابلہ کرایا گیا۔ یوں فوجیں وفادار بھی رہیں اور دادِ شجاعت بھی دیتی رہیں۔ یوں انگریز ایسے کانٹے بکھیر گیا جس سے ملت کا سینہ آج تک فگار رہے۔ آج بھی یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سپاہی خاص ضلعوں سے آتے ہیں یا خاص گھرانوں سے یا خاص ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کہنے والے یہ کہتے بھی نہیں تھکتے کہ اسلام کی رُو سے وجہ تکریم عمل ہے نہ کہ رنگ و نسب۔ ان کا یہ ایمان بھی ہے کہ مسلمان پیدائشی سپاہی ہے اور وہ اللہ کے نام پر لڑتا ہے۔ اور ایک ایک دس دس پر بھاری ہوتا ہے۔ اس ایمان کو لے کر جب بھرتی کا وقت آتا ہے تو انتخاب اسلام کی بنا پر نہیں بلکہ حسب و نسب کی اضافی نسبتوں کی رعایت سے ہوتا ہے۔ اس دور میں کہ عوامی جنگوں کا اصول چین اور ویت نام میں اپنی صداقت دکھا اور منوا چکا ہے ہم ان لاطائل بحثوں میں

الجھے ہوتے ہیں کہ سپاہی یہاں کا نہیں وہاں کا ہونا چاہیئے۔ نیز جنگ چند تربیت یافتہ افراد کا کام ہے قوم کے ہر فرد کا نہیں۔ یہ استعمار کے نقوشِ پا ہیں جنہیں ہم مٹا دینے کی بجائے پختہ تر کئے جا رہے ہیں۔ یہ استعمار کی باقیات السیئات ہیں کہ اپنے اپنوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ وہ یورپ کو تو ہم جوار سمجھ لیتے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں لیکن عوام — پاکستان کی نوّے پچانوے فی صد آبادی — ناقابلِ التفات اور ناخواندہ ہے۔ جنگِ ستمبر نے یہ حقیقت کھول کر بیان کر دی کہ دشمن کا مقابلہ عوام اور بیدار عوام ہی کر سکتے ہیں لیکن استعمار نے جو بُت خانے دماغوں میں آباد کر دیئے ہیں انہیں بدستور خانقاہوں کا نام دیا جا رہا ہے۔ یوں قولاً استعمار کے مخالف عملاً استعمار کے راستے پر دانستہ نہیں تو نادانستہ چلے جا رہے ہیں۔

گویا استعمار کے ظاہری خاتمے کے کوئی بائیس برس بعد تک بھی ہم ان امتیازات کو اسی طرح قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں جس طرح انگریز نے اپنی استعماری ضرورت کے تحت انہیں رائج کیا تھا۔ یہ بھی استعمار ہی کی دین ہے کہ ہم سیاسی، معاشی، معاشرتی، عسکری طور پر وہی نظم رائج و نافذ کئے چلے آ رہے ہیں جو انگریز نے اپنی استعماری اغراض کے لئے متشکل کیا تھا۔ چند انگریز کلیدی عہدوں پر متمکن ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ باقی جگہوں پر کارندے ہوتے تھے جو ان کی اطاعت کرتے تھے اور بلا چون وچرا نظامِ حکومت چلاتے تھے۔ انگریز کے بعد ہم نے بھی یہی کیا کہ چند کلیدی آسامیوں کو اپنے تصرف میں کر کے باقی عہدوں پر اپنے کارندے متعین کر دیئے جن کی ساری کوشش بالائی سطح کی خوشنودی حاصل کرنا اور بایں بہانہ عمرِ خود دراز کرنا ہوتی ہے۔ یہ راز ابھی تک کھل نہیں سکا کہ یہ انداز یکسر استعمارانہ ہے۔ اپنی حکومت کا مطلب اپنوں کی حکومت نہیں۔ حکومت نہ اپنوں کی ہو سکتی ہے نہ اپنوں پر ہو سکتی ہے۔ اپنے نہ حاکم ہوتے ہیں نہ محکوم۔ اپنی حکومت سے مراد مشاورت سے اجتماعی امور کا نظم و نسق ہے۔ مشاورت کا اصول کارفرما نہ ہو تو اپنی حکومت بھی استعماری حکومت ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ استعمار رخصت ہو چکا ہے، اس لئے حکومت استعماری نہیں استعمار کی آلۂ کار ہو جاتی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی بیشتر حکومتیں آج استعمار کے رحم و کرم پر ہیں۔ حالانکہ بظاہر استعمار ان علاقوں سے رخصت ہو چکا ہے۔ استعمار کی یہ آکاس بیل اس وقت تک شجرِ قومی کو لپیٹ میں لئے رہے گی جب تک استعمار کو عالمی سطح پر شکست نہیں دے دی جاتی۔ ملکی سطح پر استعمار کی شکست، استعمار کی عالمی سطح پر شکست کی تمہید ہے۔ جب تک استعمار کو عالمی سطح پر شکست نہیں دے دی جائے گی قومی سطح پر اس سے پوری طرح گلوخلاصی نہیں ہو سکے گی۔ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کے مصائبِ قومی کی علت العلل یہی ہے۔ استعمار کو عالمی سطح پر شکست دینے کے لئے یہی ضروری نہیں کہ سیاسی معنوں میں قومی سطح پر استعمار کو ختم کر دیا جائے۔ اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ اندرونِ ملک استعماری نظام کی بنیاد ہی ختم کر دی جائے اور نظمِ سیاسی کو ایسے خطوط پر متشکل کیا جائے جن سے وہ طبقات غالب بالا دست ہوں جنہیں پہلے استعماری قوت نے بے دست و پا

بنائے رکھا اور اب اس کے تتبع میں بھی اور اس کی شہ پر بھی اپنے انہیں دبائے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کے اصولِ مشاورت کی روح یہ ہے کہ کوئی بالا نہیں کوئی پست نہیں۔ حرا کی بات سوئے قوم آتی ہے اور قوم کی بات سوئے حرا جاتی ہے اور یوں حرا اور قوم ایک ہو جاتے ہیں اور ایک رہتے ہیں۔ جب تک ملکی سطح پر ایسا انقلاب رونما نہیں ہوتا جو ظلم سے دبی غالب اکثریت کو ابھار کر اپنے آپ میں لے آئے عالمی سطح پر استعمار کے خاتمے کی خاطر خواہ صورت پیدا ہونے کے امکانات زیادہ روشن نہیں ہو سکیں گے۔ ممالک ایشیا و افریقہ میں ان دنوں جو ہمہ گیر ہیجان و اضطراب پایا جاتا ہے وہ استعمار کے عطا کردہ موذی جراثیم کے عمل مسلسل کے خلاف قدرتی ردِ عمل ہے لیکن ضرورت جری قیادت کی ہے!

دخترانِ مادرِ استعمار کا شمار یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ استعمار نے اپنے عہدِ اقتدار میں ایسے ایسے مسائل پیدا کیے جن کو اس نے اپنی مطلب براری کے لئے لاینحل بنا دیا اور جاتی دفعہ آزاد ہونے والے ملکوں کے گلے مڑھ گیا۔ ایسا اتفاق سے نہیں ہو گیا بلکہ سوچی سمجھی استعماری سازش کے تحت ہوا۔ ہمارے برصغیر میں انگریز نے قدم جمائے تو وہ چین پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنے لگا۔ وہ مشرقِ بعید کے راستے سے چین کے سواحل تک پہنچا اور اپنے اڈے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مشرقی پاکستان کی طرف سے بھی چین میں مداخلت کی مہمیں جاری رکھیں۔ ادھر سے وہ تبت کے اندر تک اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہی استعماری مہمات کے نتیجے میں اس نے چین کے ساتھ اپنی مرضی سے یک طرفہ طور پر ایک حد قائم کر لی جسے اس نے میکموہن لائن کا نام دے دیا۔ اسے اہل چین نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور وہ اس کے خلاف اکثر احتجاج کرتے رہے۔ لیکن برطانیہ دھاندلی سے ایک خط کھینچ کے بیٹھ گیا۔ وہ بزور آگے بڑھ سکتا تو یہ خط کہیں آگے جا کھینچتا۔ یہ خط نہ قدرتی سرحد تھا نہ چین کے لئے قابلِ قبول۔ مگر انگریز اسے خطِ تقدیر بنا کے بیٹھ گیا۔ اس خط کو وہ ایسے پکا کر گیا کہ بھارت اور چین میں اسے مستقل نزاع کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ہندو کی برہمنی ذہنیت کو بھانپ کر انگریز جس طرح اسے اپنا کارندہ بناتا چلا آیا تھا، ہندو حکمران آج تک اس کردار سے ہٹ نہیں سکے۔ برطانیہ نے جاتے جاتے بھارت کے کان میں ایسی استعمار کی پھونک ماری کہ وہ اس خط کے متعلق چین سے گفتگوئے مصالحت کرنے کی بجائے فوجیں لے کر اس کے خلاف چڑھ دوڑا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ استعمار بھارت سے نہ رخصت ہوا ہے نہ ہو گا۔ بلکہ حکمران طبقے کا مفاد اسی میں ہے کہ اسے استعمار کی پشت پناہی حاصل رہے۔ یہیں سے دوسری حقیقت سامنے آتی ہے کہ ملکی سطح سے استعمار کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکمران طبقے بلکہ طبقات کو محرومِ اقتدار کر کے عوام کو ابھارا جائے، کیونکہ اصل طاقت وہی ہیں۔ وہ ابھر کر مؤثر نہ ہوں تو حکمران طبقے استعمار کے دست نگر اور آلۂ کار بنے رہنے پر مجبور ہوں گے۔

پاکستان کے لئے دو اہم مسئلے استعمار کی دین ہیں۔ ایک کشمیر کا ایک افغانستان کا۔ کشمیر کا مسئلہ دو وجوہات سے پیدا ہوا۔ انگریز نے اپنے استعماری اغراض کی بنا پر برصغیر کو برطانوی اور ریاستی ہند میں تقسیم کرنا ضروری سمجھا۔ یہ تقسیم یکسر بے جواز اور مصنوعی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی ہند اور ریاستی ہند کی آزادی دو جداگانہ دوائر بن گئے۔ یہ تقسیم نہ ہوتی تو کشمیر پہلے دن سے ہی پاکستان کا حصہ ہوتا۔ اس امتیاز کے باوجود کشمیر پاکستان سے کٹ نہ سکتا لیکن انگریز نے اس کھٹے میں اپنی ٹانگ اڑائے رکھنے کے لئے اصول تقسیم کے علی الرغم ایسے علاقے بھی پاکستان سے کاٹ کر بھارت کے سپرد کر دیئے جو مسلم اکثریت کی بنا پر لامحالہ پاکستان کا حصہ بنتے۔ اس دھاندلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان اور بھارت کے لئے کشمیر کا ایک بظاہر لاینحل مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ استعمار کے اثر دخل کے بغیر یہ مسئلہ اول تو پیدا نہ ہوتا اور اگر پیدا ہو جاتا تو اس کا حل معمولی رد و کد کے بعد تلاش کیا جا سکتا تھا۔ استعمار نے یہ مسئلہ پیدا کیا اور اسے لاینحل بنایا اور بنائے رکھا۔ اور اب وہ موقع پر موجود نہ ہونے کے باوجود حکم بنا بیٹھا ہے۔ اپنی پیدا کی ہوئی خرابی کا ذمہ دار بڑی ڈھٹائی سے وہ متعلقہ فریقین کو ٹھیراتا ہے اور اپنے آپ کو امن و صلح کا علمبردار سمجھتا ہے اور سمجھاتا ہے۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً عیاری سے کہتا ہے' اور ہم سنتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں ممالک آپس میں مصالحت کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ رضامند ہو جائیں تو ہم ان میں مصالحت کرا سکتے ہیں۔

افغانستان کا مسئلہ بھی استعمار ہی کا شاخسانہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ افغانستان اور مغربی پاکستان کے موجودہ علاقوں میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ مغربی پاکستان کا رُخ ہمیشہ مغرب کی طرف رہا ہے اور مغربی پاکستان اور افغانستان ایک ہی علاقہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ لاہور اور غزنی ایسے ہم شکل شہر تھے کہ دونوں میں تمیز مشکل تھی۔ افغان برصغیر میں آتے جاتے رہے۔ انہوں نے یہاں حکومت بھی کی اور حکومت کے بغیر بھی رہے۔ ان کی حکومت افغانستان میں محدود ہو کے رہ گئی تو بھی وہ ان علاقوں سے بے تعلق نہیں ہو گئے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا ہوا کہ انہیں دعوت دے کے بلایا گیا اور ان کے حکمرانوں نے یہاں کی غیر مسلم قوتوں کو شکست دی اور مسلمانوں کے اقتدار کو سنبھالا یا سنبھالا دیا۔ انگریز مغربی پاکستان پر قابض ہو گیا تو جیسے وہ مشرقی پاکستان سے چین کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا رہا اسی طرح مغربی پاکستان سے وہ افغانستان کی طرف بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا اور بالآخر اپنی سلطنت اور افغانستان میں ایک حد فاصل بنا کے بیٹھ گیا۔ یہ حد جو ڈیورنڈ لائن کے نام سے یاد کی جاتی ہے' افغانستان نے اسے قبول کر لیا اور اس کی کسی حکومت نے اس کی تنسیخ یا اس میں ردوبدل کا مطالبہ نہیں کیا۔ یوں آئینی اعتبار سے یہ حد قائم ہو گئی تو ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ افغانستان استعمار سے آزاد تو ہو گیا لیکن وہ مغربی پاکستان سے کٹ گیا۔ حالانکہ تاریخی اور تجارتی لحاظ سے دونوں کے مفاد کا تقاضا مختلف تھا۔ مغربی پاکستان اور افغانستان میں استعمار حائل ہوا تو دونوں میں وطنیت کا جذبہ پرورش پانے لگا۔ اس جذبے کا نشانہ دونوں صورتوں میں انگریز تھا۔

دونوں استعمار کے خلاف اس حد تک متفق تھے کہ افغانستان کو مدعو کیا جاتا رہا کہ وہ حملہ کر کے انگریز کو نکال دے۔ یوں نہ ہو سکا تو یہاں کے مسلمانوں نے ہجرت کر کے افغانستان چلے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ افغانستان کی مدد سے انگریزوں کو اس علاقے سے نکالا جا سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں میں سے کوئی صورت کامیاب نہ ہو سکی۔ یعنی نہ افغانستان حملہ کر کے ان علاقوں کو آزاد کرا سکا نہ ان علاقوں کے مسلمان ہجرت کر کے اُدھر سے حملہ آور ہو سکے۔ لیکن انگریز گیا تو افغانستان میں وطنیت اس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی کہ متفق علیہ ڈیورنڈ لائن وجہ نزاع بن گئی۔ کابل میں پاکستان کو اس حد تک انگریز کا جانشین سمجھ لیا گیا کہ اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے پاکستان کی رسمی درخواست پر بھی افغانستان نے پاکستان کے خلاف رائے دینا ضروری سمجھا۔ ذہن استعمار کے اثر سے آزاد ہو جائیں تو ایسے قضیے دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائیں۔

جو کچھ میکموہن لائن، ڈیورنڈ لائن اور کشمیر سے متعلق ہوا اسی طرح ایشیا اور افریقہ میں کئی اور ممالک میں ہوا۔ اقوام یورپ نے اپنے اپنے استعمار کی حدود جغرافیائی یا تاریخی تقاضوں کے مطابق نہیں رکھیں۔ جہاں جہاں تک وہ پہنچ گئیں وہاں وہاں تقسیم کے خطوط کھینچ گئے۔ یوں قومیں تقسیم ہوئیں اور متصل علاقے غیر قدرتی طور پر بٹ گئے۔ استعمار نے اپنے اغراض کے لئے ایسے مصنوعی خطوط تو کھینچے تھے لیکن جب یہ علاقے اپنے اپنے طور پر آزاد ہوئے تو یہ خطوط ان کے مابین وجہ نزاع بن گئے۔ جو نئی آزاد حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے استعمار کی قائم کی ہوئی سرحدوں کو بین الاقوامی سرحدات کہہ کر قائم رکھنا ضروری سمجھا اور قدرتی تقاضوں کے مطابق ان میں کسی قسم کی ترمیم کے روادار نہ ہوئے۔ یہ وطنیت کی غیر مفاہمانہ روش استعمار کی ہی پیدا کردہ ہے۔ خود استعمار نے جاتے جاتے ان خطوط کو سیدھا اور معقول کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ ایسی طرح ڈالی کہ بعد میں مفاہمت اور مصالحت کی فضا میں انکے بارے میں تصفیہ ہو سکے۔ استعمار نے یہ نزاعات قصداً برقرار رکھے اور بعد میں حیلوں بہانوں سے ان کو ہوا دیتا رہا تاکہ اسے پھر سے مدعو نہ کر لیا جائے تو وہ چودھری بن کے ان میں حکم بنا رہے اور اپنے مفاد کی تکمیل کراتا رہے۔ اپنے مفاد کی اس طرح کی تکمیل میں استعمار کی طرف سے آزاد حکومتوں کو یہ خاص طور پر باور کرایا جاتا ہے کہ وہ آزادی کی ذمہ داری کے پوری طرح اہل نہیں تھے لیکن ان کے حال پر کرم کر کے فیاضی سے انہیں قبل از وقت آزاد کر دیا گیا ہے ورنہ چاہیئے تو یہ تھا کہ سارے قضیے حل ہو جاتے تو آزادی کا سوال پیدا ہوتا۔ آزاد حکومتیں ابھی تک پوری طرح استعمار کی اس چال کو سمجھ نہیں سکیں۔ وہ آپس میں دست و گریباں ہیں اور نہیں سوچتیں کہ جن پتلیوں کا وہ تماشا دیکھ یا دکھا رہی ہیں ان کے تار کون ہلا رہا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آئندہ صحبت میں بیان کی جائے گی۔

(باقی)

بُنیادی جمہُوریتیں

خالص تنظیمی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو بنیادی جمہوریتوں کا نظام بڑے مفید مطلب نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ فوجی نظام اسی لئے اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل رہتا ہے کہ اسے نیچے سے اوپر تک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اوپر سے ایک ہدایت نافذ ہوتی ہے تو وہ تدریجاً نیچے اترتی ہوئی، ایک ایک فرد تک پہنچ جاتی ہے۔ اور عملی تجربہ کے بعد اس کے حسن و قبح کے متعلق رپورٹ، ہر میدان سے گذرتی ہوئی، اوپر تک پہنچ جاتی ہے یہی طریق امت کی حیاتِ اجتماعیہ کے ہر گوشے میں کارفرما ہونا چاہیئے تھا۔ مساجد کا نظام، درحقیقت اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہر محلہ میں ایک مسجد۔ اور پھر شہر کی مرکزی مسجد جامع۔ اور عالمگیر حیثیت سے مسجد الحرام (خانہ کعبہ) اسی تنظیم کے مختلف مراحل تھے، جو اب محض ایک رسم بن کر رہ گئے۔ اس اعتبار سے بنیادی جمہوریتوں کی تنظیمی تقسیم، اجزائے ملت کی شیرازہ بندی کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن (بدقسمتی سے) اس کی عملی تشکیل کچھ ایسی خرابیوں کی نذر ہو گئی جس سے اس کی افادیت ضائع ہو گئی۔

اس میں پہلی خرابی تو یہ ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کا نام تو بہت بڑا ہے لیکن ان کے ذمہ کام فقط اتنا ہے کہ وہ پارلیمان اور صدر کے انتخاب میں ووٹ دیں اور بس۔ اس فریضہ سے سبکدوش ہو جانے کے بعد وہ پانچ سال کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں اور اپنے نام کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر معاشرتی خرابیوں اور بدنظمیوں میں اضافہ کا موجب بنتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ نظام بجد بدنام ہو گیا ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے (اور یہ خرابی اِسی تنظیم کے ساتھ مختص نہیں۔ یہ ہمارے موجودہ نظمِ انتخابات کی عمومی خرابی ہے) کہ نہ ابتدائی امیدواروں کے لئے اور نہ ہی ان کے چیئرمینوں کے لئے، تعلیم کی شرط ہے اور نہ ہی کیریکٹر کی۔ اس کے ممبروں کے ذمہ تو کوئی کام نہیں ہوتا اس لئے ان کے اَن پڑھ ہونے سے زیادہ نقصان نہیں ہوتا لیکن چیئرمینوں کے ذمے، عائلی قوانین سے متعلق تنازعات کے فیصلے جیسا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ آپ سوچیئے کہ ایک اَن پڑھ آدمی کو جب اس قسم کے مقدمات فیصلہ کرنے کا فریضہ سونپ دیا جائے تو اس سے کیا کیا حماقتیں سرزد نہیں ہوں گی۔ اَن پڑھ تو ایک طرف، ہم نے دیکھا یہ ہے کہ ان میں اکثر اچھے خاصے پڑھے لکھے چیئرمین بھی عائلی قوانین

کی مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان تنازعات کے تصفیہ میں' پرانے زمانے کے آنریری مجسٹریٹوں کی سی مضحکہ خیز حرکات کا اعادہ ہونے لگ گیا ہے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ ان حرکات کا خمیازہ ان مظلوم عورتوں کو اٹھانا پڑتا ہے جن کی (کسی حد تک) داد رسی کے لئے یہ قوانین وضع اور نافذ ہوئے تھے۔

جہاں تک ان کے کیریکٹر کا تعلق ہے' اس پر قلم اٹھاتے وقت، ندامت سے ہمارا سر جھک جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان میں سب لوگ ایسے ہیں ـــ ان میں بڑے شریف حضرات بھی ہیں ـــ لیکن اکثر ایسے ہیں (اور ان میں بعض چیئرمین بھی شامل ہیں) جو اخلاقی جرائم کے سزا یافتہ، یا پولیس کے "بستہ ب" کی فہرست میں داخل ہوتے ہیں۔ ان ارکان کی اس اخلاقی حالت سے' اس تنظیم کے متعلق جو تأثرات ثبت ہوتے ہیں' ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک چیز تو بالکل واضح ہے۔ ان چیئرمینوں کے پاس ہمارے شریف گھرانوں کی معزز عورتوں کے تنازعات تصفیہ کے لئے جاتے ہیں ـــ ہم سمجھتے ہیں کہ اس "مطلع" کے بعد' "مقطع" عرض کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ـــ یہ بیچاریاں' اپنے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنے کے لئے ان کے پاس جاتی ہیں اور سر پیٹتی واپس آتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قانون میں یہ شق موجود ہے کہ یہ خواتین خود ان کے ہاں نہ جائیں بلکہ اپنے نمائندے بھیجیں۔ لیکن ان میں سے بدنیت حضرات ایسے الجھاؤ پیدا کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان بیچاریوں کو ان کے پاس مجبوراً جانا پڑتا ہے ـــ اور جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ملک کی اسّی۔ نوّے فیصد جاہل اور دیہاتی آبادی کے تنازعات کا تصفیہ بھی انہی چیئرمینوں سے متعلق ہوتا ہے' تو مسئلہ کی نزاکت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک' اس تنظیم کو مفید بنانے کے لئے حسب ذیل اصلاحات ضروری ہیں:-

(۱) اس تنظیم کو انتخابی ادارہ رہنے دیا جائے یا نہ رہنے دیا جائے' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ـــ لیکن ان کا فریضہ ووٹ ڈالنے تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک میں' بڑی تعداد میں' چھوٹے چھوٹے کام ایسے ہیں جن میں انتظامیہ کا وقت، توانائی اور روپیہ خواہ مخواہ صرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً بلدیات سے متعلق مختلف امور ـــ صفائی ـــ اشیائے خورد و نوش کی دیکھ بھال ـــ سڑکوں کی مرمت ـــ روشنی کا انتظام۔ نظامِ آب رسانی ـــ ابتدائی مدارس وغیرہ ـــ یا دیوانی کے چھوٹے چھوٹے تنازعات۔ یا ایسے جھگڑے جن کا تصفیہ باہمی مصالحت سے بآسانی ہو سکتا ہے لیکن جن کے لئے اسوقت خواہ مخواہ پولیس کے پاس جانا پڑتا ہے اس قسم کے جملہ امور اس تنظیم کی تحویل میں دیئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض امور تو اس وقت بھی چیئرمینوں کے تحویل میں ہیں لیکن ان پر صحیح طریق سے عمل درآمد نہیں ہوتا۔

(۲) جب انہیں اس قسم کے اختیارات دیئے جائیں تو ظاہر ہے کہ ان کی (QUALIFICATIONS) بھی زیادہ

ہونی چاہئیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ممبروں کے لئے کم از کم پرائمری تک اور چیئرمینوں کے لئے میٹرک تک کی تعلیم ضروری قرار دی جائے۔

(۳) حکومت کے محکمہ بنیادی جمہوریت سے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی امور سے متعلق، وقتاً فوقتاً ضروری ہدایات صادر ہوتی رہیں، اور بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کا فریضہ ہو کہ وہ ان ہدایات کو اپنے حلقہ کے افراد کو سمجھائیں اور ان کے تاثرات کو متعلقہ گوشوں تک اوپر پہنچائیں۔

(۴) جو امور چیئرمینوں کی تحویل میں دیئے جائیں، ان کے لئے انہیں ضروری ٹریننگ دیجائے اور اس ٹریننگ کورس کا پاس کرنا ان کے انتخاب کی لازمی شرط قرار دیجائے۔

(۵) سب سے ضروری اور بنیادی شرط یہ ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کی رکنیت کے امیدواروں کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ اپنی درخواست کے ساتھ اس قسم کا سارٹیفکیٹ پیش کریں کہ وہ کسی اخلاقی جرم کے سزا یافتہ نہیں اور پولیس کے ہاں ان کا نام بدقماشوں کی فہرست میں داخل نہیں۔

(۶) اگر کسی چیئرمین کے کیریکٹر کے خلاف، اس کے متعلقہ حلقہ کی اکثریت شکایت کرے، تو ڈپٹی کمشنر اس شکایت کی تحقیقات کرے۔ اور الزام ثابت ہوجانے کی صورت میں، اس چیئرمین کو برطرف کر دیا جائے۔

(۷) جن تنازعات میں کسی عورت کا پیش ہونا ناگزیر ہو، اسے تنہا نہ بلایا جائے بلکہ وہ اپنے ساتھ اپنی رضامندی کے مطابق، کسی مرد کو لے کر آئے۔ اور اگر چیئرمین سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو، یا اس سے انصاف کی توقع نہ رہے تو ڈپٹی کمشنر اس تنازعہ کو کسی دوسرے چیئرمین کے سپرد کر دے۔ مروجہ قوانین میں یہ حل موجود نہیں ہے۔

(۸) سرکاری ملازموں کی طرح چیئرمینوں کو عملی سیاست میں حصہ لینے یا کسی سیاسی پارٹی کا ممبر بننے کی ممانعت ہونی چاہیئے۔

ان تجاویز میں سے جن کا تعلق انتخابات سے ہے (یعنی بنیادی جمہوریت کے انتخاب سے) ان پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ انتخابات میں ضروری شرائط کو ملحوظ رکھا جائے۔

اگر حکومت اس باب میں ضروری اقدامات نہ کرے، تو ہم ووٹ دینے والے حضرات سے گزارش کرینگے کہ وہ انہی امیدواروں کو ووٹ دیں جو تعلیم اور کیریکٹر کی مندرجہ بالا شرائط کو پورا کریں اور یوں اربابِ حل و عقد پر اس حقیقت کو واضح کر دیں کہ

تجھ پہ قابو نہیں، دل پہ تو ہے قابو اپنا!

حقیقی جمہوریت اسی کو کہتے ہیں جس میں آپ کا اپنے دل پر قابو ہو!

(۔۔۔)

حقائق و عبر

(۱) ہمارا ٹیلی ویژن

کچھ سال اُدھر ہمارے ہاں یہ شور اُٹھا کہ ہمارے سینما میں یورپ اور امریکہ سے برآمد کردہ ایسی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جو جرائم سے بھرپور اور سراغ رسانی سے معمور ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری نئی نسل شروع ہی سے ارتکابِ جرم کے رموز و اسرار سے واقف ہونے کی وجہ سے جرائم کی طرف ملتفت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ حکومت کی طرف سے ان فلموں کی درآمد اور مظاہرہ کے خلاف کوئی احکام یا ہدایات جاری ہوئیں یا نہیں البتہ ذرائع نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا اور ملک میں ٹیلیویژن نصب کر دیا گیا اس جدید ترین سائنٹیفک ذریعہ نشر و اشاعت کے افتتاح کے وقت کہا یہ گیا کہ یہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کافی مدد دے گا۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے ہوتا یہ ہے کہ ہر جدید ایجاد کے افادی پہلو تو گم ہو جاتے ہیں اور اسکے مضرت رساں اثرات ملک میں عام ہو جاتے ہیں۔ یہاں ٹیلی ویژن کی تنصیب سے بھی یہی ہوا۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

چنانچہ اب ہوا یہ ہے کہ وہی جرائم سے بھرپور فلمیں جن سے بچانے کے لئے ہم نے اپنے بچوں کو سینما جانے سے روک لیا تھا، ہمارے گھروں کے کونوں کھدروں میں در آئی ہیں۔ چنانچہ شام ہوتے ہی بچے ٹیلیویژن کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس پر (FUGITIVE) اور (MAN FROM U.N.C.L.E) اور نامعلوم کون کون سی سراغ رسانی اور جرائم پیشگی کی فلمیں دیکھتے اور ان کے تباہ کن اثرات کو اپنے معصوم سینوں میں محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ بچے ان فلموں میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں کہ وہ ٹیلی ویژن کے شروع ہونے سے گھنٹوں پہلے ان کا انتظار کرنے لگ جاتے ہیں اور دوسری صبح اُٹھ کر ان پر تبصرہ شروع کر دیتے ہیں۔

اس قسم کی فلموں نے امریکہ میں کیا گل کھلایا ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو جس رفتار سے وہاں جرائم

میں اضافہ ہو رہا ہے، اس کے اعداد و شمار سامنے لائیے۔ مثلاً ریڈرز ڈائجسٹ کی دسمبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں یہ رپورٹ درج ہے کہ امریکہ میں ۱۹۶۷ء میں اوسطاً ہر بیس سیکنڈ کے بعد نقب زنی کا واقعہ، ہر تیس سیکنڈ کے بعد سرقہ کی واردات، ہر اڑتالیس سیکنڈ کے بعد موٹر کار کی چوری، ہر دو منٹ کے بعد کسی پر حملہ کی واردات، ہر اڑھائی منٹ کے بعد رہزنی، ہر اُنیس منٹ کے بعد زنا بالجبر۔ اور ہر اڑتالیس منٹ کے بعد قتل کی واردات ہوتی تھیں۔ یہ حالت ۱۹۶۷ء میں تھی۔ ۱۹۶۸ء کے ابتدائی تین ماہ میں وہاں ۱۹۶۷ء کے مقابلہ میں جرائم سترہ فیصد بڑھ گئے اور اب وہاں خوف و ہراس کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے شہروں تک میں کوئی شخص اسلحہ بغیر شام کے بعد گھر سے باہر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ ہم سنتے ہیں کہ ویت نام کی جنگ کے سات سال کے عرصہ میں ہمارے قریب پچیس ہزار افراد مارے گئے۔ لیکن امریکہ میں اتنے ہی عرصہ کے دوران سرسٹھ ہزار سے بھی زیادہ آدمی قتل کر دیئے گئے۔ وہاں ہر روز قریب ایک ہزار موٹر کاروں کی چوری ہوتی ہے اور یہ وارداتیں پچیس سال سے کم عمر کے نوجوان کرتے ہیں (ضمناً جرائم کی یہ حالت اس ملک میں ہے جہاں ان کی روک تھام کے لئے اربوں روپیہ سالانہ صرف ہو رہا ہے۔ وہاں +
اسی رپورٹ کے مطابق — پولیس کے سپاہی کی تنخواہ پانسو ڈالر — یعنی قریب اڑھائی ہزار روپیہ ماہوار ہے اور اسے کافی قرار نہیں دیا جا رہا)۔ یہ ہیں وہ نتائج جو ان فلموں نے اس ملک میں پیدا کئے ہیں۔ اب وہی فلمیں ہمارے ہاں درآمد کی جاتی ہیں اور گھروں کے اندر بیٹھنے والے بچوں کو ٹیلی ویژن پر دکھائی جا رہی ہیں۔

ہم اربابِ بست و کشاد سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان لوگوں سے اتنا پوچھنے والا کوئی نہیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو اور قوم کی نئی نسل کو کیا بنانے میں مصروف ہو؟ اور پھر ہم اپنے پریس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کو بھی اس قسم کے تباہ کن پروگراموں کے خلاف کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی! ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کی بنی بنائی فلمیں اس لئے دکھائی جاتی ہیں کہ اس میں ٹیلیویژن والوں کو کچھ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ — فلم آئی اور اسے ریل پہ چڑھا دیا — لیکن جب اس محکمہ کے ملازمین اور وابستگان کو اتنے اتنے مشاہرے اور معاوضے ملتے ہیں تو وہ محنت کرنے سے جی کیوں چراتے ہیں۔ اور اگر وہ محنت کرنا نہیں چاہتے، یا مفید پروگرام تیار کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں، تو ٹیلیویژن کے پروگرام مختصر کر دیں۔ اس سے کم از کم یہ نونہالانِ ملت جھلسنے سے تو بچ جائیں گے۔ یا انہیں درآمد کردہ تفریحی یا معلوماتی فلمیں دکھائیں۔

—— (۰) ——

(۲) یہ بچپن —— ویٹ نام میں انسانیت جس طرح بے دریغ ذبح ہو رہی ہے اس

پہ کون سا قلب حساس مضطرب اور کون سا دیدۂ بینا خون فشاں نہیں۔ پچھلے سال خدا خدا کر کے متعلقہ فریق گفتگوئے مصالحت پر رضامند ہوئے۔ اس مقصد کے لئے ان کے نمائندگان پیرس میں جمع ہیں اور ساری دنیا کی آنکھیں ان کی طرف لگ رہی ہیں کہ ان میں کب صلح ہو اور کب خون ریزی اور آتش فشانی کا یہ طوفانی سلسلہ ختم ہو۔ یہ حضرات وہاں کتنے ہی دنوں سے بیٹھے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بحث کس اہم سوال پر ہو رہی ہے؟ اس سوال پر کہ یہ نمائندگان، جس میز پر بات چیت کرنے کے لئے بیٹھیں اس کی شکل کیا ہو؟ امریکہ نے تجویز پیش کی ہے کہ میز مستطیل ہونی چاہیئے جس پر فریقین آمنے سامنے بیٹھ جائیں۔ شمالی ویٹ نام نے کہا ہے کہ میز مربع شکل کی ہونی چاہیئے۔ متعلقہ فریق اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو ایک تجویز یہ پیش ہوئی کہ مربع شکل کی میز کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے اور بیچ میں تھوڑا سا فاصلہ رکھ دیا جائے۔ اس پر امریکہ نے کہا کہ یہ شکل ہمیں منظور نہیں۔ بہتر ہو کہ نصف بیضوی یا نصف گول شکل کی دو میزیں آمنے سامنے رکھ دی جائیں۔ شمالی ویٹ نام نے کہا کہ نہیں۔۔! ایک ہی گول میز ہو اور اس کا نصف نصف حصہ فریقین بانٹ لیں۔ اس تقسیم کے لئے کہا گیا کہ درمیان میں ایک تار کھینچ دیا جائے۔

ویٹ نام میں انسانیت تباہی کے گھاٹ اتر رہی ہے اور مصالحتی بورڈ کے ارکان —— جن کا شمار دنیا کے بلند ترین سیاستدانوں میں ہوتا ہے —— اس بچپنے کے کھیل میں مصروف ہیں کہ ہمارے بیٹھنے کے لئے میز کس قسم کی ہو!

خدا جانے انسانی شعور کب اپنے عہد طفولیت سے نکل کر جوانی کی عمر کو پہنچے گا؟ —— ان مقام انسانیت سے ناآشنا دانشوروں کو کون بتائے کہ ترقی اس کا نام نہیں کہ آپ چاند کی سطح پر انسان اتار سکتے ہیں۔ ترقی اس کا نام ہے کہ آپ انسانیت کی سطح کو کس قدر بلند کر سکتے ہیں! کس قدر صحیح کہا تھا اس قرآنی بصیرت رکھنے والے دیدہ ور نے —— دورِ حاضرہ کے انسان کے متعلق کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا\
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا\
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا\
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا (اقبالؒ)

زندگی کی شبِ تاریک میں سحر صرف وحیٔ خداوندی کے آفتاب عالمتاب سے ہو سکتی ہے اور مغرب کا آسمان اس چشمۂ نور سے محروم ہے۔ پھر اس پہ نمودِ سحر کیسے ہو!

❊

ہمارا پریس

ایک واقعہ ٹمبکٹو میں نہیں، مغربی پاکستان کے دارالسلطنت شہر لاہور میں ہوتا ہے۔ لاہور میں بھی کہیں "وسن پورہ" میں نہیں ہوتا، ہائیکورٹ کے اندر ہوتا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل دو ذرائع سے اخبارات میں چھپتی ہے۔ ایک تفصیل (جو نوائے وقت کی ۳ر جنوری کی اشاعت میں صفحہ اول پر جلی سرخیوں سے چھپی ہے) یہ ہے۔

مغربی پاکستان ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ..... وغیرہ نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے جس میں کہا ہے کہ ..... عیدالفطر سے قبل مرکزی وزیر قانون مسٹر ایس۔ ایم ظفر نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ وہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن لاہور کو عید کے بعد خطاب کریں گے۔ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری نے اس بیان کی پُرزور تردید کی اور واضح کیا کہ مسٹر ایس۔ ایم ظفر کو بار ایسوسی ایشن کی طرف سے کوئی دعوت نہیں دی گئی اس لئے کہ وکلاء کی بھاری اکثریت موجودہ حکومت کے خلاف ہے۔ اسکے باوجود مسٹر ایس۔ ایم ظفر آج قریباً دس بجے جبکہ ہائیکورٹ میں ۷ر جنوری تک تعطیلات ہیں اپنے چند رفقاء کے ساتھ آگئے۔ اس وقت ان کے رفقاء کے سوا اور کوئی ممبر بار میں موجود نہ تھا۔ مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر کی بار میں آمد کے متعلق جونہی دوسرے ارکان کو پتہ چلا وہ بھی فوراً بار روم میں پہنچے، اور مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر کی اچانک آمد پر احتجاج کیا۔ جب مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر نے میز پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے کی کوشش کی تو ارکانِ بار نے ان کا مخالفانہ نعروں سے استقبال کیا اور پُرزور مطالبہ کیا کہ وہ ایک غیر جمہوری وزیر قانون ہوتے ہوئے ممبروں کو خطاب کرنے کے مستحق نہیں ہیں۔ پورا نصف گھنٹہ مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر کے خلاف نعرے لگتے رہے اور آخر کار مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر بار روم کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر نے ہائیکورٹ بار میں اپنی آمد کے لئے وہ وقت منتخب کیا جبکہ ہائیکورٹ ۷ر جنوری تک بند ہے۔ نیز بار ایسوسی ایشن کے تمام چیدہ لیڈر پاکستان بار کونسل کے اجلاس منعقدہ کراچی میں شرکت کے لئے لاہور سے غیر حاضر تھے۔

تاہم وزیرِ قانون کو مخالفانہ نعروں کے ساتھ بار سے روانہ کیا گیا۔"

اب اسی واقعہ کی تفصیل، پ۔پ۔پ (ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان) کی زبان سے سنیئے جو روزنامہ مشرق کی ۱۳ جنوری کی اشاعت میں صفحہ اول پر جلی سرخیوں میں شائع ہوئی ہے۔ (اور طرفہ تماشہ کہ خود نوائے وقت میں یہ تفصیل بھی الگ شائع ہوئی ہے)۔ سنیئے۔

مرکزی وزیرِ قانون مسٹر ایس۔ ایم ظفر نے وکلاء پر زور دیا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی اور قومی مسائل پر غور کرتے وقت تعمیری اندازِ فکر اختیار کریں۔ وہ آج صبح ہائیکورٹ بار روم میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کر رہے تھے۔ اس اجلاس میں تقریباً ڈھائی سو وکلاء نے شرکت کی۔ وزیرِ قانون جب بار سے خطاب کرنے کے لئے ہال میں داخل ہوئے تو ان کا تالیاں بجا کر خیر مقدم کیا گیا۔ تاہم پانچ وکیلوں کے ایک گروپ نے شور مچانا شروع کر دیا کہ وہ ان کی تقریر نہیں سنیں گے بار ایسوسی ایشن کے بعض سنیئر ارکان نے بتایا ہے کہ یہ افراد باہر سے آئے تھے اور ڈسٹرکٹ بار سے تعلق رکھتے تھے۔

اس کے بعد ہے۔

اجلاس کے بعد ہائیکورٹ بار لاؤنج میں مسٹر ایس۔ ایم ظفر کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اس موقعہ پر بار ایسوسی ایشن کے بعض سنیئر وکلاء نے ان چند وکیلوں کے رویئے پر غم و غصہ کا اظہار کیا جنہوں نے اجلاس میں ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔

جس وقت وزیرِ قانون دوسرے وکلاء کے ساتھ چائے پی رہے تھے، ان کی تقریر کے دوران شور مچانے والوں میں سے ایک صاحب وہاں آئے اور وزیرِ قانون سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد انہوں نے مسٹر ظفر سے ایک سوال بھی پوچھا۔ اس پر وزیرِ قانون نے کہا آپ ان لوگوں میں شامل تھے جو بار میں شور مچا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم تقریر سننا نہیں چاہتے۔ کاش آپ میری تقریر کے بعد وہیں پر مجھ سے سوال پوچھتے۔ تاہم آپ جس وقت چاہیں مجھ سے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ چائے کے بعد مسٹر ایس۔ ایم۔ ظفر پھر بار کے ہال میں آئے۔ جہاں آپ وکلاء سے بات چیت کرتے رہے۔ وہ اپنے پرانے رفقاء سے ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔ وہ بار روم سے رخصت ہوئے تو وکلاء نے ظفر زندہ باد کے نعروں سے انہیں رخصت کیا۔ وہ شام کو بذریعہ خیبر میل واپس راولپنڈی روانہ ہو گئے۔

آپ سوچئے کہ جس ملک کے پریس کی یہ حالت ہو کہ لاہور شہر جیسے مرکزی مقام میں ہونے والے ایک واقعہ کی خبریں اس تضاد کو لئے ہوئے شائع ہوں، اس ملک کے باشندوں میں صحیح سیاسی شعور خاک بیدار ہو سکتا ہے! کوئی

زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی تعجب انگیز، خلافِ توقع سے واقعہ کا ذکر کرتا، اور اس پر اعتراض کیا جاتا تو وہ جواب میں کہہ دیتا کہ صاحب! میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی ہے تو ہر ایک کو اس پر اطمینان ہو جاتا کہ جب یہ خبر اخبار میں چھپی ہے تو پھر یہ سچی ہی ہوگی اور اب یہ حالت ہے کہ "اخباری خبر" کی اصطلاح جھوٹی بات کے لئے بطور محاورہ استعمال ہوتی ہے۔

اے کاش! ملک میں کوئی اخبار ایسا ہوتا جس کے متعلق لوگ اطمینان سے کہہ سکتے کہ اگر یہ خبر اس میں شائع ہوتی ہے تو پھر یہ غلط نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ہاں رونا یہ رویا جاتا ہے کہ ملک میں پریس کو آزادی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑی "آزادی" اور کیا ہو سکتی ہے کہ اخبارات میں رطب و یابس ہر قسم کی خبریں چھپتی ہیں۔ ان میں اکثر جھوٹی ہوتی ہیں لیکن نہ ایسی خبروں پر ان اخبارات سے باز پرس ہوتی ہے اور نہ ہی خود ان میں اتنی اخلاقی جرأت ہوتی ہے کہ خبر کی تحقیق ہو جانے کے بعد اپنے قارئین سے معافی مانگ لیں کہ ہم نے ان تک غلط خبر پہنچا دی۔ حتےٰ کہ ان غلط خبروں کی بنا پر بڑے بڑے شریف لوگوں کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ نہایت معزز خواتین کی آبرو جاتی رہتی ہے۔ خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ نفرت و انتقام کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ افرادِ معاشرہ کو بھگتنا پڑتا ہے لیکن ان اخبارات سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ باز پرس تو ایک طرف، جس قدر کوئی اخبار "سنسنی خیز" خبریں چھاپتا ہے اتنی ہی اس کی اشاعت بڑھ جاتی ہے۔

اے کاش! ملک میں اگر قرآنِ کریم کے ایک حکم پر بھی عمل ہوتا تو ملک اس قسم کے طوفانِ کذب و افترا سے محفوظ رہ جاتا۔ اور وہ حکم یہ ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ ۔ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۔ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور قلب سے ہر ایسی بات کے متعلق باز پرس ہوگی (جو تمہاری زبان یا قلم سے نکلے۔ یا جسے سن کر تم بلا تحقیق اسے سچا سمجھ لو۔)

ضرورت ہے ایک ایسے اخبار کی جو اس حکمِ قرآن کو اپنا شعار بنا لے۔ وہ ایسا شعار اختیار کر لے اور پھر دیکھے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی، جب چاروں طرف جھوٹ کی بھرمار ہے، اس کا کس قدر احترام ہوتا ہے اور اس کی مانگ کس قدر بڑھتی ہے۔

جہانِ نو

ادارہ کی مطبوعات کی تفصیلی فہرست جس میں ہر ایک کتاب کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ اس سے اسکا پورا آئینہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک کارڈ لکھ کر بلا قیمت طلب فرمائیے۔ ناظم

تکملہ

علامہ تمنا عمادی کا جو مبسوط مقالہ "ہماری تاریخ" کے عنوان سے طلوع اسلام کی متعدد قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کا تکملہ پیش خدمت قارئین ہے ـــــ!

قیاس بلا سند غلط بھی ہو جاتا ہے

اسی لئے بغیر سند قوی کے مسائل شرعیہ میں قیاس سے کام لینا جائز نہیں!

حالات ابن جریر طبری کے بعض حصے جو میرے مقالہ میں شائع ہوئے ہیں۔ اُن کی تصحیح

میں نے اپنے مقالے میں اس کا ذکر کیا ہے کہ مجھ کو کتاب معجم الادباء نہ مل سکی۔ دو عزیزوں نے جو کچھ نوٹ میرے پاس مختصر طور سے لکھ کر بھیجدیئے انہیں پر اعتماد کر کے میں نے اپنے مقالے میں ابن جریر کے حالات بقدر ضرورت لکھ دیئے۔ حالات کے بارے میں زیادہ کُرید کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ میرے مقالے کا موضوع ابن جریر کی ذاتی سوانح نہ تھی بلکہ اُن کی روایتی حیثیت تھی۔ اس لئے حالات جس قدر خطوط میں لکھے تھے اسی سے اور کسی قدر قیاس سے کام لے کر لکھے۔ ابن جریر جو پہلے پہل اپنے وطن آمل سے باہر نکلے تو رَی پہنچے۔ رَے کے سب سے زیادہ مشہور و معروف محدث ابوحاتم رازی سے ملنے کا ذکر کسی خط میں نہ تھا اور نہ ان کی تفسیر یا تاریخ میں کوئی روایت ابوحاتم سے مجھ کو نظر آئی۔ اس لئے میں سمجھا کہ ابن جریر رَے پہنچے تو ابوحاتم سے ملے ہی نہیں۔ بعد کو معجم الادباء کے سرسری مطالعہ کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ ابن جریر رَے پہنچے تو پہلے ابوحاتم الرازی ہی سے ملے۔ اُن سے ابن جریر کو طبرستان کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوئی اور ایک حدیث قیاس کے متعلق جو امام شعبہ سے مروی ہے وہ بھی حاصل کی۔ اسکے بعد یہ وہاں سے اُٹھے تو اُن کو اپنے مزاج کے مطابق نہ پاکر پھر اُن سے کچھ ربط رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور ابن حمید جیسے مشہور کذاب کی صحبت اختیار کی پھر ادھر ایسے ہی لوگوں سے وہاں ملے ابوحاتم الرازی

آخر عجمی تھے۔ مائل بہ تشیع تھے۔ اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰن کو جو ابن ابی حاتم کہے جاتے ہیں ان کو مشہور شیعہ محدث و قاری فضل بن شاذان سے قرآن مجید کی تعلیم دلوائی۔ اس لئے ابن جریر کو ان کی طرف سے بے رغبتی کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ وضّاع و کذاب نہ تھے۔ نہ خود جھوٹی روایتیں گھڑتے تھے نہ جان بوجھ کے جھوٹی حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ابن جریر نے دیکھا کہ یہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ اس لئے ان کو چھوڑ دیا۔

۲ عموماً ہر طالب العلم تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو پھر فراغت کے بعد اپنے وطن ہی میں واپس آکر تصنیف و تالیف و درس و تدریس میں مصروف ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی چھوٹے سے قریئے کا ساکن تھا تو اپنے مرکزی شہر میں اقامت گزین ہو کر علمی مشاغل میں مشغول ہوتا ہے۔ عزیزوں کے خطوط میں اس کا ذکر نہ تھا کہ تحصیل علم کے بعد کہاں بیٹھ کر ابن جریر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے اس لئے قیاساً لکھ دیا کہ وہ تحصیلِ علم کے بعد طبرستان میں مقیم ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے۔ اپنے مولد و مسکن آمل میں اقامت نہ کی۔ چونکہ وہ خاص شیعوں کا مسکن تھا اور یہ از روئے تقیہ سُنّی بنے ہوئے تھے اس لئے طبرستان میں اقامت پسند کی جو ان کا مرکزی شہر تھا۔ معجم الادبار دیکھنے سے میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ معلوم ہوا کہ تحصیل علم سے فراغت کے بعد ابن جریر بغداد میں مقیم ہو گئے جو اس وقت پورے عالم اسلامی کا علمی مرکز تھا اور تا دمِ مرگ وہیں رہے اور وہیں وفات پائی۔

۳ ابن جریر کی وفات و دفن کے بارے میں خطیب بغدادی نے عجیب متضاد اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کو بھی لکھ دینا ضروری تھا جو اس مقالے میں درج نہ ہو سکا۔ خطیب کی تاریخ بغداد میرے پاس نہیں ہے مگر معجم الادبار میں بہ ضمن ترجمہ ابن جریر جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

قال غیر الخطیب و دُفن لیلاً خوفاً من العامة لانه کان یتهم بالتشیّع و اما الخطیب فانه قال ولم یؤذن به احدٌ فاجتمع علے جنازتہ من لا یحصی عددہ الا اللہ تعالیٰ وصلّی علے قبرہ عدۃ شھور لیلاً و نہاراً۔ ورثاہ خلق کثیر من اھل الدین و الادب۔ (معجم الادبار ص۳۰)

خطیب کے سوا سارے اہل سیر نے کہا ہے کہ ابن جریر عوام[ع] کے خوف سے رات کے وقت (چپ چاپ) دفن کر دیئے گئے۔ کیونکہ وہ تشیع کی وجہ سے بدنام تھے۔ مگر خطیب بغدادی نے کہا ہے کہ باوجود اسکے کہ کسی کو ان کی وفات کی خبر نہیں دی گئی، کوئی عام اعلان نہیں کیا گیا۔ پھر بھی اُن کے جنازے پر اتنے لوگ جمع ہو گئے جن کی گنتی

ع شیعہ علماء اپنی کتابوں میں اہل سنت کو عامّہ اور شیعوں کو خاصّہ لکھا کرتے ہیں۔ یاقوت حموی کے بارے میں بھی تشیع کا گمان کیا گیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ یاقوت نے معجم الادبار میں یہاں العامہ سے اہل سنت کو مراد لیا ہو۔ ۱۲ منہ غفرلہٗ

اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور ان کی قبر پر مہینوں تک نماز جنازہ رات دن پڑھی گئی اور اہل دین
واہل ادب میں سے بہتروں نے ان کے مرثیے لکھے۔

خطیب بغدادی کی ولادت ۳۹۲ھ وفات ۴۶۳ھ۔ وفات ابن جریر کے ۷۲ برس کے بعد پیدا ہوئے تھے ابن جریر کے کسی دیکھنے والے کو بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ابن جریر کے جنازے میں کسی شریک ہونے والے کو کب دیکھا ہوگا خطیب کی اس روایت کو ابن حجر نے بھی لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۱۰۲ میں بعبارتہ نقل کر دیا ہے۔ بروایت احمد بن کامل ۔ غالباً خطیب نے بھی بروایت احمد بن کامل ہی یہ خلاف عقل جھوٹی داستان لکھی ہوگی۔

احمد بن کامل ابن جریر کے اہم شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۳۵۰ھ کے محرم میں وفات پائی۔ ابن جریر کے ارشد تلامذہ میں سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں سے ابن جریر کے حالات لوگ روایت کرتے ہیں ۔ احمد بن کامل کی وفات کے ۷۲ برس بعد خطیب پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اگر خطیب نے بروایت احمد بن کامل ہی ابن جریر کے جنازہ و دفن کی داستان اپنی تاریخ میں لکھی ہے تو خطیب اور احمد بن کامل کے درمیان کون تھا؟ اور ابن حجر تو سب سے متأخر ہیں۔ ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر کی وفات کے ۵۶۳ برس بعد اور احمد بن کامل کی وفات کے ۴۲۳ برس بعد اور وفات خطیب کے ۳۱۰ برس کے بعد۔ اس لئے ابن حجر کا بغیر اسناد کے صرف بروایت احمد بن کامل لکھ دینا کوئی وزن نہیں رکھتا جب کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ خطیب بغدادی کی طرح یہ بھی ابن جریر کے عاشقوں میں سے ہیں۔ البتہ خطیب بیک واسطہ یا بدو واسطہ احمد بن کامل سے روایت کر سکتے ہیں مگر جب تک اس درمیانی راوی کا نام سامنے نہ آئے، روایت کی صداقت از روئے روایت تسلیم نہیں کیجا سکتی۔ اگرچہ احمد بن کامل ابن جریر کے شاگرد رشید تھے تو پھر ابن جریر ہی جیسے ہوں گے۔

مگر درایت کی رُو سے دیکھئے تو کس قدر خلاف عقل بات معلوم ہوتی ہے ابن جریر بے شک بہت بڑے ادیب تھے صحیح یا غلط تفسیر بھی متعدد جلدوں میں لکھ ڈالی اور متعدد جلدوں میں تاریخ بھی مگر ان کی زندگی میں اہل بغداد نے ان کی کیا قدر کی؟ جو ان کے مرنے کے بعد سارے اہل شہر نے وہ عقیدتمندی دکھائی جو نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دکھلائی نہ شیعوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دکھائی نہ اپنے کسی اور امام کے ساتھ۔ کیا محدثین بغداد نے ابن جریر سے حدیثیں سنیں اور ان سے روایت کیں؟ کیا ان کی تفسیر محدثین و اکابر علمائے بغداد میں ان کے وقت میں شرف قبول حاصل کر سکی؟ کیا ان کی تاریخ کو ان کے وقت میں اکابر بغداد نے معتمد علیہ سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا؟ جب تک وہ بغداد میں زندہ رہے ان کے تعلقات تو انہیں بغدادیوں سے رہے جو بغداد میں کذب افترا میں بدنام تھے۔ جہاں گئے ایسے ہی لوگوں سے تعلقات رکھے۔ بغداد میں کون سی ہر دلعزیزی ان کو جیتے جی حاصل تھی کہ مرنے کے بعد سارے شہر نے وہ عقیدت مندی دکھائی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ بھی ان کی وفات کے بعد دکھانے کی نہ سوجھی تھی[1]۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالےٰ کے معتقدین ان بزرگوں کی زندگی میں جس قدر تھے اہل سیر کو معلوم ہے ان بزرگوں کی ہر دلعزیزی کا عشر عشیر حصہ بھی ہر دلعزیزی میں سے ابن جریر کو اپنی زندگی میں نہ مل سکا۔ مرتے ہی یکایک ہر دلعزیزی کا عام طوفان کس طرح امنڈ آیا؟ میں تو سمجھتا ہوں خطیب بغدادی کی تاریخ میں کسی نے ان کے بعد یہ الحاق کر دیا ہے ورنہ خطیب جیسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ اس قدر مبالغہ آمیز روایتیں جس کے ہر جملے سے دروغ بافی نمایاں ہو رہی ہو وہ خود کبھی لکھتے اور اگر لکھتے تو اس روایت کو لکھ کر اس کی تکذیب بھی ضرور کرتے۔

اور بالفرض تنہا خطیب نے ایسا لکھ دیا تو جب اس کے بالکل برعکس دوسرے اہل سیر لکھ رہے ہیں تو ایک جماعت کے قول کے مقابل ایک شخص واحد کا قول جماعت کے قول کے بالکل برعکس کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

باقی رہا خطیب کے ماسوا دوسرے اہل سیر نے جو کہا ہے وہ واقعہ تو صحیح لکھا ہے مگر محض مختصر اور جو وجہ اس کی لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ واقعہ مختصر اس اعتبار سے کہ ابن جریر کو ان کے اعزہ و تلامذہ نے رات کے وقت[2] ان کے مکان میں ہی دفن کر دیا تھا جیسا کہ بعض اہل سیر نے لکھا ہے۔ اس کا ذکر خطیب نے نہیں کیا۔ مگر یہ بھی غلط ہی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً غلط ہی سمجھ کر خطیب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور عوام کا خوف ان کے تشیع کی وجہ سے بھی غلط ہے۔ بغداد میں متعدد شیعے محدث تھے جو کھلم کھلا شیعے تھے مگر کسی کے مرنے کے بعد عوام نے ان کے جنازے کے ساتھ کسی قسم کی بھی نامناسب حرکت نہیں کی۔ ابن جریر تو اپنے کو سنی ظاہر کرتے تھے۔ صرف تشیع[3] "قلیل" کی وجہ سے عوام انکے جنازے کی بے حرمتی کیوں کرتے؟ ان کی زندگی میں راہ چلتے جب کسی نے ان کے ساتھ کسی قسم کی شرارت نہ کی تو مرنے کے بعد ان کے جنازے کے ساتھ برا برتاؤ کرنا اس وقت کے مسلمانوں سے بعید از عقل ہے۔ اسی بغداد میں عبّاد بن العوّام بن عمر الغلابی ابو سہل الواسطی ثم البغدادی (ولادت ۱۱۸ھ وفات ۱۸۵ھ) شیعہ محدث ابن جریر سے متقدم گذر چکے تھے۔ اور علی بن جعد الجوہری البغدادی جو بنی ہاشم کے آزاد کردہ غلام اور کٹر شیعے تھے بغداد ہی میں رہتے تھے جن کی ولادت ۱۳۶ھ کی اور وفات ۲۳۰ھ میں تھی۔ یہ بھی ابن جریر سے متقدم ہی تھے۔ ان کی وفات کے وقت ابن جریر چھ برس کے تھے۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن صالح العتکی الازدی الکوفی بغداد میں آکر بس گئے تھے متوفی ۲۳۵ھ جن کی وفات کے وقت ابن جریر گیارہ برس کے تھے۔ یہ بہت متعصب شیعے تھے۔ امہات المومنین اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص میں ایک کتاب لکھی تھی۔ ابن جریر کی ولادت کے قبل سے شیعے محدثین بغداد میں اپنے وطن سے آ آ کر اقامت گزین ہوتے تھے۔ اگر بغداد کے عوام کے لئے ابن جریر پہلے شیعے ہوتے جو بغداد میں آکر

---

[1] یعنی مہینوں قبر پر نماز جنازہ دن رات پڑھنا۔

[2] جیسا کہ ابن حجر نے ابن جریر کے بارے میں لسان میزان میں لکھا ہے۔ ۱۲ منہ

بے تھے یا سب شیعوں سے زیادہ بدزبان و تبرا باز ہوتے تو کہا جا سکتا تھا عوام کو ان سے چڑ سی تھی۔ ایسا ہوتا تو یقیناً عوام ان کو ان کی زندگی ہی میں اتنا پریشان کرتے کہ ان کو بغداد چھوڑنا پڑتا۔ مگر نہ یہ پہلے شیعے تھے بغداد میں آکر بسنے والے نہ کھلم کھلا بدزبان و تبرا باز تھے۔ نہ ان کی زندگی میں کسی نے کبھی ان سے تعرض کیا۔ تو پھر ان کے مرنے کے بعد ان کے جنازے کی بے حرمتی لوگ کیوں کرتے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ یہ چپ چاپ رات کو دفن کر دیئے گئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ دن کو ان کا جنازہ لے کر قبرستان جاتے تو ان کے خاص اعزہ و تلامذہ کے سوا شہر کا کوئی ممتاز شخص ان کے جنازے میں شریک نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ان کی تفسیر و تاریخ جن لوگوں نے دیکھی تھی اس کو محسوس کر لیا تھا کہ یہ مشہور کذابوں وضاعوں سے روایت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جو ان کی ولادت سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے اور جو روایتیں خود گھڑ گھڑ کے اسناد بنا بنا کر اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔ ایسی باتیں لکھتے ہیں جو ان کے سوا کوئی نہیں لکھتا۔ اسی لئے سارے محدثین نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ کوئی ثقہ محدث ان سے روایت نہیں کرتا تھا۔ اس کے سوا کوئی وجہ ان کو رات کے وقت چپ چاپ دفن کر دینے کی نہیں ہو سکتی۔ اور گھر میں دفن کرنے کی بات بھی غلط ہے۔ دفن کئے گئے مقبرے ہی میں مگر چپ چاپ رات کے وقت۔

البتہ ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ اکابر محدثین و مفسرین اس وقت بغداد میں جمع تھے۔ ابن جریر نے وضاعین و کذابین کی من گھڑت باتیں اپنی تفسیر و تاریخ میں اگر بھر دی تھیں اور ان کی تفسیر و تاریخ اگر قابلِ اعتماد ان لوگوں کے نزدیک نہ تھی تو ان لوگوں نے خود کوئی صحیح تفسیر صحیح روایات و عالی اسناد سے اور صحیح تاریخ بھی لکھ کر ابن جریر کی تردید کیوں نہ کی اور بعد والوں کو ابن جریر کے دامِ تزویر سے بچانے کی کوشش کیوں نہ کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اکابر علمائے بغداد نے ضرور ایسا کیا۔ چالیس جلدوں میں اور اسی جلدوں میں تفسیر لکھی تاریخ کی بھی کتابیں لکھیں۔ مگر مستعصم باللہ خلیفہ بغداد نے جہاں ابن علقمی اور نصیر الدین طوسی کو اپنا معتمد علیہ وزیر و مشیر بنا کر خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ کیا اور خود ہلاک ہوا وہاں بغداد کے کتب خانوں کو بھی برباد کیا۔ ابن علقمی و نصیر الدین طوسی نے تو پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ بغداد کو لٹوا کر یہاں کے کتب خانوں کو بھی دریا برد کرائینگے۔ اس لئے اپنے مسلک کی کتابوں کو اپنے پسندیدہ نسخوں کو جن کتب خانوں سے پہلے نکلوا لے سکے ان کو پہلے ہی نکلوا لیا اور جن کو پہلے نہ نکلوا سکے ان کو جب علماء و محدثین کے گھروں سے کتابیں نکلوائی جانے لگیں تو ان میں سے اپنے ہم خیالوں اور ہم مذہبوں کی تصنیفات کو چھانٹ کر رکھ لیا اور باقی سب کتابوں کو دریا برد کرایا جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اتنی کتابیں دریا میں ڈالی گئیں کہ بیچ دریا میں ایک سڑک بن گئی جس پر ادھر کا آدمی اُدھر اور اُدھر کا آدمی اِدھر آنے جانے لگا۔ کیا صرف حکومت کے کتب خانے ہی اس قدر کتابیں تھیں؟ محدثین و مفسرین و فقہا کے ذاتی کتب خانوں کی کتابیں بھی ان کے گھروں سے نکلوا کر دریا میں ڈالی گئیں۔ علمائے رجال و سیر بعض مفسرین کی تفسیروں کا ذکر اپنی کتابوں میں کرتے

ہیں مگر وہ کتابیں دنیا سے مفقود ہیں۔ میری کتاب تراجم المفسرین میں ان کا ذکر ہے مگر افسوس کہ وہ اب تک شائع نہ ہو سکی۔ اس لئے یہ کہنا کہ دوسرے لوگوں نے صحیح تفسیر اور صحیح تاریخ کیوں نہیں لکھی؟ صحیح نہیں ہے۔ دوسروں نے ابن جریر سے متقدمین و معاصرین و متأخرین نے فتنہ ہلاکو سے قبل تک بغداد میں کیا کیا کچھ نہ لکھا تھا۔ آخر اتنی کتابیں جن سے دریا پٹ جاتے کہاں سے آئیں؟ اور کیا ان میں زیادہ تر کتابیں احادیث و تفسیر و تاریخ و سیر ہی کی نہ ہوں گی؟ اس وقت کے لوگ تو علم تفسیر و علم حدیث ہی کو اصل علم سمجھتے تھے اور تاریخ و سیر تو ان کی روزمرہ کی چیز تھی مگر ابن علقمی و نصیر الدین طوسی کی کورنمکی و غداری کی بدولت جہاں خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوا وہاں سارا اسلامی علمی ذخیرہ بھی دریا برد ہو کر رہ گیا۔ بغداد کے علمی ذخیروں میں وہی کتابیں رہ گئیں جن کو ابن علقمی و نصیر الدین طوسی نے محفوظ رکھ لیا تھا۔ جن میں ابن جریر کی تفسیر و تاریخ بھی تھی۔ یا چند ایسی کتابیں جو بعض غیر معروف لوگوں کے یہاں ہوں گی۔

ہلاکو خان کو ملک گیری سے غرض تھی نہ کہ کتابوں کے برباد کرنے سے۔ کتابیں برباد کی گئیں صرف ابن علقمی و نصیر الدین طوسی کے اصرار سے۔ ورنہ چنگیز خان کو کتابوں سے اتنی عداوت کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار کی صبح ۔ ۹½ بجے
۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور

کراچی میں
ہر اتوار کی صبح ۔ ۹½ بجے
(بذریعہ ٹیپ)
سیمینار ہال ۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ

سیالکوٹ میں
ہر اتوار ۔ دو بجے بعد دوپہر
(بذریعہ ٹیپ)
چوہدری محمد دین ٹی سٹال کرسچن ٹاؤن

جلالپور جٹاں میں
ہر جمعرات ۔ ۷ بجے شام
(بذریعہ ٹیپ)
دفتر ادارہ خدمت خلق

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

۱۔ لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، بیان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اسکا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے۔

۲۔ اسلام کیا ہے، کیا؟

یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائیگی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رُو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض وغایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ چیپ ایڈیشن۔ چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام

سلیم ایک تعلیمیافتہ نوجوان ہے جسے ملّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اسکے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کیطرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول آٹھ روپے۔ دوم، سوم چھ چھ روپے

۴۔ نظامِ ربوبیت

نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کیمونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اسکے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت چار روپے۔

۵۔ بساطِ بصیرت

قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں ـــ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۶۔ اسبابِ زوالِ اُمّت

ملّا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اسلئے ہم ذلیل ہیں مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے اسے معلوم کرنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت دو روپے

۷۔ اسلامی معاشرت

اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ اندازِ بیان سلیس اور دلچسپ ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور